SEPTEMBER
2025

جدید ادب کا اشاریہ

ماہنامہ بیاض لاہور

جشنِ میلاد النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

مبارک ہو

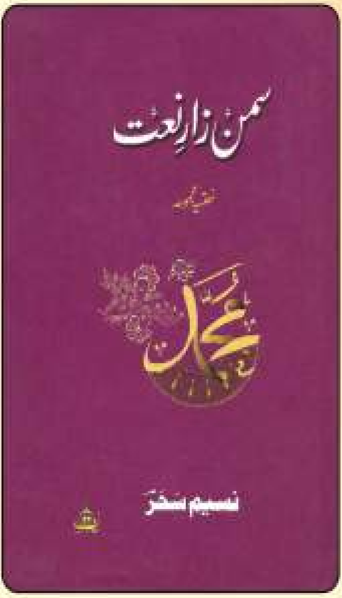
سمن زارِ نعت
محمد
نسیم سحر

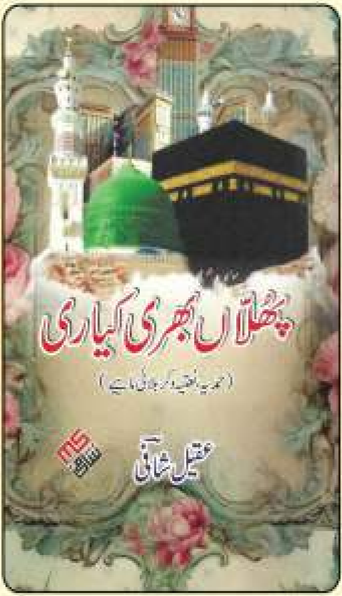
پھلاں بھری کیاری
عقیل شافی

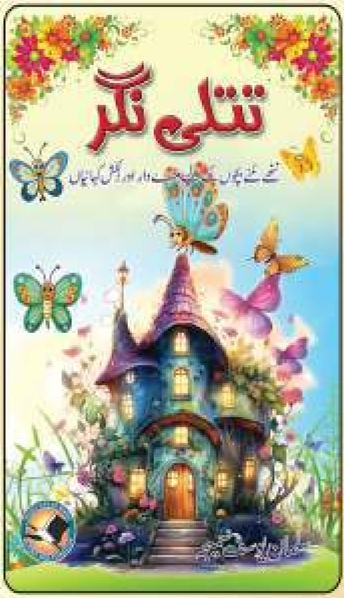
تتلی نگر

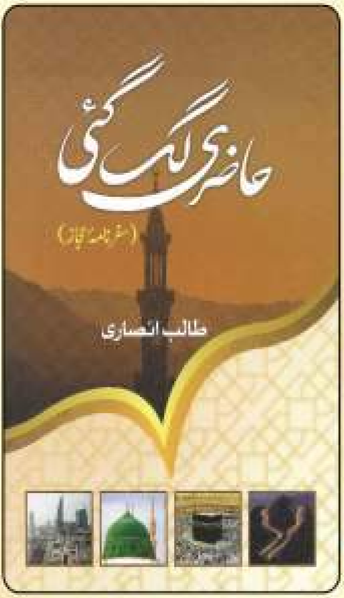
حاضری لگ گئی
طالب انصاری

بانی مدیر: خالد احمد

غزل

دور کچھ بھی نہیں ، اے جاں ، تری دارائی سے
کبھی دڑّانہ گزر جا ، مری تنہائی سے

دھول کے پھول ہوا دیکھ کے کیوں کھلتے ہیں
پوچھتا کون ؟ ترے شہر کی پروائی سے

کیا خبر قافلۂ دل زدگاں کب اترے
کام تجھ کو نکل آئے ، مری رسوائی سے

چاند نکلا تو ستاروں نے پرے باندھ لیے
خوف آیا مجھے خورشید کی تنہائی سے

کس کو فرصت کہ نظر داغِ ہنر پر ڈالے
کوئی رسوا نہیں ہوتا ہنر آرائی سے

ربِ عزّت نے تہی نم نہ کسی کو رکھا
دامنِ عشق بھرا لالۂ رسوائی سے

نسبتِ قیس بنی آخری تنکا خالد
بارِ محمل نہ اُٹھا ناقۂ دانائی سے

خالد احمد

We support BAYAZ for its role in literary and intellectual development of our society

THE TAQ ORGANIZATION

Logistics Solutions/3PL | Freight Forwarding | Air Cargo Wholesale

We are a different organization in Pakistan

■ **Karachi:** (021) 34541301-7 ■ **Lahore:** (042) 37883901-9
■ **Sialkot:** (052) 3554301-6 ■ **Rawalpindi/Islamabad:** (051) 5162704-5
■ **Faisalabad:** (041) 8542924 ■ **Peshawar:** (091) 5252311 ■ **Multan:** (061) 4510465

Email: info@tlpk.com Website: www.taq.com.pk
UAN: +92-42-111 222 827

پاکستان میں سب سے زیادہ شائع ہونے والا ادبی جریدہ

بانی مدیر: خالد احمد

جدید تر ادب کا نقیب

ماہنامہ بیاض لاہور

ABC CERTIFIED

جلد نمبر: 33 - ستمبر 2025 - شمارہ نمبر: 9

مدیر اعلیٰ: عمران منظور

مدیر: نعمان منظور

مجلس ادارت	اعجاز رضوی	نوید صادق	کنور امتیاز احمد	جاہد احمد

تزئین و آرائش: ہیثم عمران

کمپوزنگ: حافظ محمد عبداللہ

سرورق: جشن عید میلاد النبیؐ
یوم دفاع پاکستان

قیمت: 100 روپے

سالانہ زر اعانت 1000 روپے بیرون ملک 100$ پاکستانی روپے میں
فیصل بینک لمیٹڈ
ای ایم ای ہاؤسنگ سوسائٹی، لاہور
A/c Title: Monthly BAYYAZ
اکاؤنٹ نمبر: 0256007000002582

بیاض گروپ آف پبلی کیشنز

سید اطہر شہید روڈ 16 کلومیٹر ملتان روڈ لاہور-53700

فون: 3-92-42-37513000 فیکس: 92-42-37512517

Email: bayaz@trackntie.com www.trackntie.com

www.trackntie.com
BAYAZ
ویب سائٹ برائے مطالعہ

عمران منظور ایڈیٹر پبلشر اور پرنٹر نے ٹریک اینڈ ٹائی پرنٹرز 16 کلومیٹر [illegible] سید اطہر شہید روڈ ملتان روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر بیاض سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَیْرُ الْوٰرِثِیْنَ

اے میرے پروردگار! مجھے اکیلا نہ چھوڑ اور تو سب وارثوں سے بہتر ہے۔

اشاریہ

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
1	حمد	سید ریاض حسین زیدی، اکرم سحر فارانی، علی رضا	7 تا 9
2	نعت	محمد ارشاد، سید ریاض حسین زیدی، واصف سجاد، مظہر امام سرور حسین نقشبندی، علی رضا، اعجاز روشن، سید تحسین گیلانی محمد ظفر اقبال نوری، احمد امیر پاشا	10 تا 19
3	عقیدت	شاہ محمد سبطین شاہجہانی، محمد انیس انصاری، انور حسن، فیض رسول فیضان نوید عاجز، مرزا آصف رسول	20 تا 25
4	رباعیات	محمد ارشاد، گلزار بخاری، محمد تصیر زندہ، سعید اشعر	26 تا 29
5	قطعات	مرزا آسی اختر	30
6	ہائیکو	اجمل اعجاز	31
7	ملی نغمے	راجہ عبدالقیوم، شاہ محمد سبطین شاہجہانی	32 تا 34
8	افسانے	حنیف باوا، بلقیس ریاض، فرخندہ شمیم، وسیم جبران افضل ہزاروی، رانا محمد شاہد، شاہ روم خان ولی، رانیہ مسعود تنہا، محمد شفیق، ماریہ انور، عاصم بخاری	35 تا 74
9	مائکروفکشن	صنوبر پرویز	75

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
10	غزلیں	خالد احمد، جلیل عالی، محمد ارشاد، شریف ساجد، شاد محمد سبطین شاہجہانی راحت سرحدی، طارق بٹ، اکرم ناصر، طالب انصاری رضا اللہ حیدر، افتخار شاہد، مسعود احمد، سعد اللہ شاہ، اقبال سرویہ عرفان صادق، شاہد فرید، قیوم طاہر، افروز رضوی، رخشندہ نوید واصف سجاد، ابو طالب انیم، ذکی طارق، شوکت محمود شوکت احمد جلیل، شبہ طراز، اعجاز روشن، فیض رسول فیضان اصغر علی بلوچ، ثمینہ سیّد، وسیم جبران، میثم محسن، اکرم جاذب ہمایوں پرویز شاہد، سرور فرحان، افضل ہزاروی، عابد خان عابد خالدہ انور، علی حسین عابدی، نائلہ راٹھور، قمر نیاز، مستحسن جامی ریاض ندیم نیازی، عزیز عادل، احمد ساقی، افتخار الحق محمد اقبال انجم، شبیر نازش، الماس شبی، علمدار حسین اورنگزیب حسام حر، صغیر احمد صغیر، امجد خان تجوانہ، ظہور چوہان راجہ عبدالقیوم، محمد اشفاق بیگ، بشیر احمد حبیب، طلحہ غفور نبیل قیصر، عبدالرؤف زین، احمد امیر پاشا، عاصم بخاری بلال قمر خان، مہر علی، امر مہکی، نوید صادق، اعجاز رضوی	76 تا 141
11	طنز و مزاح	نور کمال شاہ	142 تا 143
12	مضامین	محمد ارشاد، پیروز بخت قاضی، جلیل عالی، نسیم سحر طالب انصاری، ہارون الرشید، علی رضا، افتخار الحق صدام ساگر، محمد امین ساجد سعیدی، عمر عزیز، نوید عائل احمد ساقی، راشد جاوید احمد	144 تا 205
13	غم ورثہ ہے ناولٹ	وردانہ نوشین خان	206 تا 215
14	نظمیں	جلیل عالی، راحت سرحدی، سید افسر ساجد، محمد انیس انصاری طارق بٹ، رخشندہ نوید، شوکت محمود شوکت، تسنیم کوثر منظر اعجاز منظر، علمدار حسین، محمد اقبال انجم، شبیر آکاش، ذکی طارق نائلہ راٹھور، فرح شاہد، صغیر احمد صغیر، امجد بابر، محمد کلیم کوکی گل، مہر علی، منیب سلطان چیہا، نوید صادق، اعجاز رضوی	216 تا 241

حمد

خدا محیط ہے، سب پر، بزرگ و برتر ہے
ہر ایک اس کے مقابل حقیر و احقر ہے

خجل، خفیف ہُوا، اس سے جو بھی دور ہوا
قریب تر ہے جو اس سے وہی موقر ہے

زباں شناس ہوئے اس سے بے نشاں رشتے
رگوں میں تیرتے جذبوں کا وہ نواگر ہے

زمانے بھر کے خداؤں سے بے نیاز ہوا
شہِ زمانہ ہے اس در کا جو گداگر ہے

مزا ملا ہے بڑا اس کو بادشاہی کا
جو زیرِ سایہ ہے اس کے وہی قلندر ہے

ریاضؔ اس کی عنایت ہے سانس کا رشتہ
حیات اس سے ہے، خالق وہی سراسر ہے

سید ریاض حسین زیدی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہر سخن تھا ہم اہلِ غم کے لیے
دل شکن ، دل خراش دل آزار

حمد

خالقِ کون و مکاں ربُّ العلیٰ ہے تیری ذات
سارا عالم ہے گدا حاجت روا ہے تیری ذات

تیری قدرت سے رواں ہیں زندگی کے کارواں
مشکلوں کی راہ میں مشکل کشا ہے تیری ذات

غنچہ و گُل میں ہے خوشبُو چاند تاروں میں چمک
در حقیقت قسمتِ ارض و سما ہے تیری ذات

ورطۂ حیرت میں ہیں سارے جہاں کے فلسفی
ہر جگہ ہر آن کیسے رونما ہے تیری ذات

شب کی چادر پر سجاتا ہے ستاروں کے چراغ
صبحِ تاباں میں رُخِ شمس الضحیٰ ہے تیری ذات

حسن تیرا دور تر ہے سرحدِ ادراک سے
عشق کی نظروں میں لیکن جلوہ زا ہے تیری ذات

بخش دینا اپنی رحمت سے سحرؔ کی لغزشیں
میرے مولا مالکِ روزِ جزا ہے تیری ذات

اکرم سحر فارانی

حمد

علی رضا

وہ بصیرت وہ رہنمائی دے
ہر حقیقت مجھے دکھائی دے

میرے لفظوں سے خوشبوئیں پھوٹیں
میری سوچوں کو پارسائی دے

تیری حمد و ثنا میں عمر کٹے
بس یہی طرزِ خوشنوائی دے

روح کو رکھ حصار میں اپنے
دل کو آفات سے رہائی دے

فقر میرا کمال تک پہنچے
لذتِ عجزِ انتہائی دے

مجھ کو رکھ گنجِ بے نشاں میں مدام
کب کہا ذوقِ خود نمائی دے

سلطنت درد کی عطا کر کے
منزلِ شوق تک رسائی دے

نعتؐ

قائم ہے رب سے رابطہ تجھ مجتبیٰؐ کے بعد
پایا سدا جواب دعا کا دعا کے بعد

ہوتا نہ گر ترا رُخِ روشن دلیلِ راہ
تھی اک بلا کے بعد بلا اک، بلیٰ کے بعد

ماں کی کسی بھی آمنہ کی سی دعا کہاں
مانگا ہے جس نے تجھ کو خدا سے خدا کے بعد

دیمک عصا کو کھا گئی مٹی کے لیپ کر
پھر منکدر ہوا یدِ بیضا عصا کے بعد

باقی رہی نہ نقشِ سلیمانؑ کی آبرو
ہر نقش بے اثر ہے ترے نقشِ پا کے بعد

اکسیر تر ہے از دمِ عیسیٰؑ تری نگاہ
حاجت نہیں ہے دم کی دُکھی کو شفا کے بعد

تجھ سے وفا ہے شرطِ شفا وہ نہیں تو پھر
ہے موت ہر مرض کی دوا ہر دوا کے بعد

ہر کس کے بس کی بات نہیں پیروی تری
رہ میں ہے غارِ ثور بھی غارِ حرا کے بعد

تیرا مقام ہے دلِ یزداں میں، ماسوا
ہے ماسوا ہی، جائیں کدھر؟ ماسوا کے بعد

ہیں بے زباں تصوف و عرفان و فلسفہ
اُٹھتا ہے جب سوال کہ کیا کیا ہے کیا؟ کے بعد

تجھ پر مرا درود جہاں تھک گئی صبا
پہنچائے گی نسیم اُڑا کر صبا کے بعد

بعد از خدا بزرگ ہے تو ہی، سو خلق پر
واجب تری ثنا ہے خدا کی ثنا کے بعد

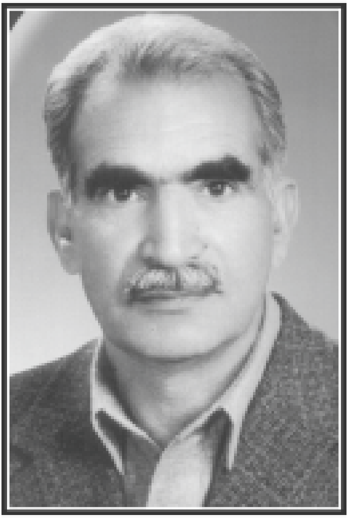

محمد ارشاد

نعتؐ

سید ریاض حسین زیدی

چھٹی شفاعتوں کی مرے نام آئے گی
پیشِ حضورؐ نعت بہت کام آئے گی

بکھرے، درودِ پاک کے نذرِ حضورؐ ہیں
خوشبو سی تا ابد سحر و شام آئے گی

پیشِ نظر ہوں گنبدِ خضریٰ کی جالیاں
ہریالی قلب و جاں میں پھر عام آئے گی

عزمِ سفر مدینے کا ہر دم جواں رہے
پھر منزلِ مراد بہرگام آئے گی

ہم خوش دلی سے آپؐ کا دامن جو تھام لیں
دنیائے ہست و بود تہِ دام آئے گی

یارب! ریاضِ نعت سے گر سرخروئی ہو
خوشبو درِ ہنر سے لبِ بام آئے گی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

چہرہ تمام رنگ تھا، پیکر کرن تمام
کجلا کے رہ گئے مہ و پروین تن تمام

نعتؐ

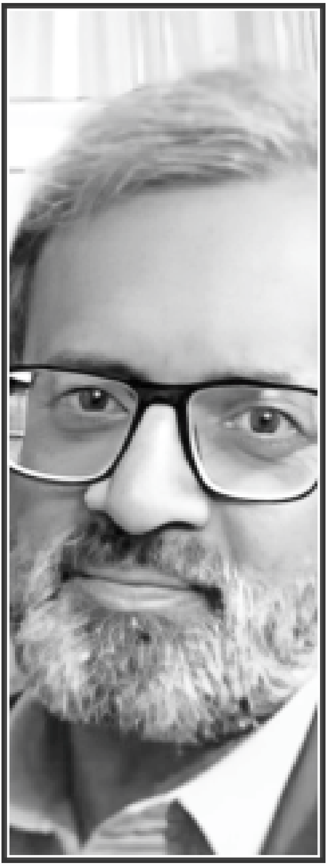

کیسا دیار کون سا رستا ہے آنکھ میں
دنیا میں ہی بہشت کا جلوہ ہے آنکھ میں

سرسبز کیوں دکھائی نہ دے یہ جہاں تمام
"عکسِ جمالِ گنبدِ خضرا ہے آنکھ میں"

شہرِ نبیؐ ہر ایک حوالے سے لاجواب
کب اس کا سارا حسن سمایا ہے آنکھ میں

محدود ہے بساط ہماری نگاہ کی
اور بیکرانیوں کا تقاضا ہے آنکھ میں

نورِ ولائے آلِ محمدؐ کا فیض ہے
چاروں طرف فضائے معلیٰ ہے آنکھ میں

تاریکیوں کا خوف دلوں سے نکل گیا
پڑھتے ہوئے درود اجالا ہے آنکھ میں

واصف سجاد

گُل کِھل رہے ہیں کِھلتے سُروں کی اٹھان سے
نقشِ قدم ہیں یاسمن و نسترن تمام

انتخاب
- خالد احمد -
نعمان منظور

نعتؐ

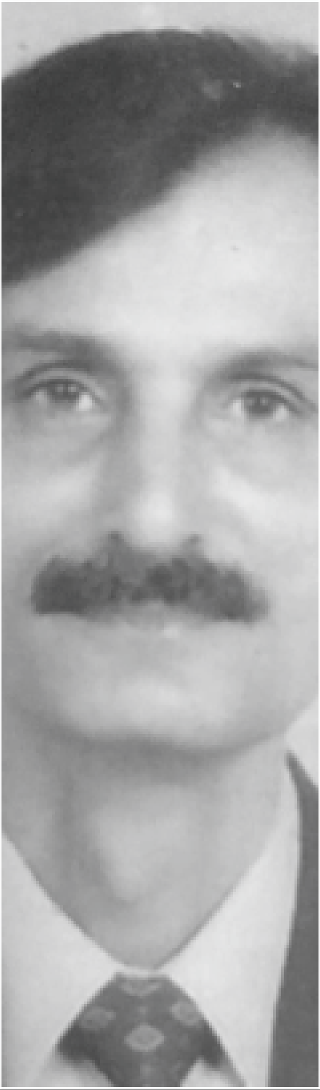

میرا سارا ہنر حضور کا ہے
نعت میں سب اثر حضور کا ہے

خوشبوؤں میں بسا ہوا ہے جو
قریۂ خوش نظر حضور کا ہے

وہ جو امن و سکوں کا ضامن ہے
دہر میں وہ نگر حضور کا ہے

بزمِ کونین میں ہمیشہ سے
ذکر شام و سحر حضور کا ہے

جو بھی آئے تمام نبیوں میں
مرتبہ معتبر حضور کا ہے

اُس کا ظاہر نہ کیوں معطر ہو
جس کے باطن میں ڈر حضور کا ہے

وہ جو محور ہے نکہتوں کا امام
ساری دنیا میں در حضور کا ہے

مظہر امام

نعتؐ

یوں ہی نہیں دنیا ہوئی شیدائی ہماری
سب نعت کا صدقہ ہے پذیرائی ہماری

ذکرِ شہِ والا کی رفاقت کا اثر ہے
محفل سے کہیں بڑھ کے ہے تنہائی ہماری

سرکار چھپا لیجیے دامانِ کرم میں
ہو جائے سرِ حشر نہ رسوائی ہماری

اوجھل ہوا جاتا ہے یہ گنبد جو نظر سے
"ایسے تو چلی جائے گی بینائی ہماری"

کھل اٹھتے ہیں سب سن کے ثنا آلِ نبی کی
پھر اس پہ طبیعت بھی ہے مولائی ہماری

سنتا ہے بھلا کون غمِ دل کا فسانہ
ہوتی ہے اسی در پہ ہی شنوائی ہماری

ہم اہلِ زمیں کیسے انھیں بھولے ہوئے ہیں
جن کو سرِ افلاک بھی یاد آئی ہماری

صد شکر کہ دیکھا تجھے اے گنبدِ خضرا
لگتا ہے کہ اب جان میں جان آئی ہماری

طیبہ کی ہوا سے ہوئی جس روز ملاقات
اس دن ہوئی خوشبو سے شناسائی ہماری

گو لوٹ تو آئے ہیں درِ شاہِ اُمم سے
پر روح مدینے سے کہاں آئی ہماری

مدحت کا سخن حضرتِ تابشؔ کی زمیں میں
چمکی ہے عجب قافیہ پیمائی ہماری

حیران فرشتے بھی ہوئے جائیں گے سرورؔ
جس وقت لحد نعت نے مہکائی ہماری

سرور حسین نقشبندی

نعت ﷺ

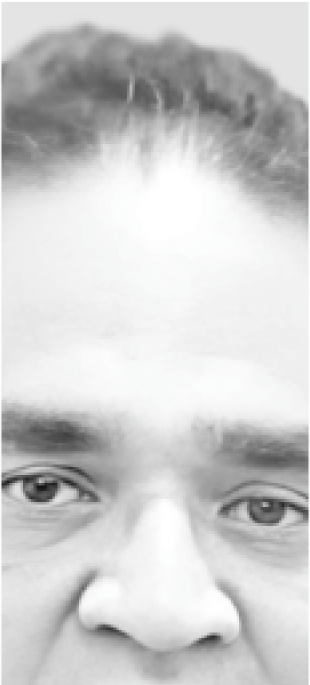

گزر رہی ہے مری زندگی قرینے سے
لگاؤ جب سے ہوا ہے مجھے مدینے سے

مئے ولائے نبی کا خمار مت پوچھیں
عجب سرور ملا دل کو جس کے پینے سے

نبی کے حسنِ عمل کی کہیں مثال نہیں
گرے پڑوں کو لگایا ہے جس نے سینے سے

حضور! سیرتِ اقدس کی روشنی بخشیں
کہ اب تو تو شرم سی آنے لگی ہے جینے سے

متاعِ حرف وسخن اور یہ جذب وکیف کا رنگ
عطا ہوا ہے مجھے آپ کے خزینے سے

جسے نجات کا ضامن کہا رسالت نے
مری بھی روح کو نسبت ہے اُس سفینے سے

عطائے نعت کا ماحول بن گیا ہے رضاؔ
جڑے ہوئے ہیں مری سوچ میں نگینے سے

علی رضا

نعتؐ

چشمِ نم نعت لکھ رہا ہوں میں
دم بدم نعت لکھ رہا ہوں میں

شاعری مجھ سے اب نہیں ہوتی
کم سے کم نعت لکھ رہا ہوں میں

لے کے ہر سانس میں خدا کا نام
ہر قدم نعت لکھ رہا ہوں میں

اپنی تنہائی کا نہیں افسوس
بے بھرم نعت لکھ رہا ہوں میں

اشک جاری ہیں یاد میں اُنؐ کی
بے قلم نعت لکھ رہا ہوں میں

میں نے دیکھا ہے خواب اک ایسا
ہر جنم نعت لکھ رہا ہوں میں

مٹتے جاتے ہیں ایک اک کر کے
سارے غم ۔ نعت لکھ رہا ہوں میں

کیوں ہو شکوہ خدا سے پھر روشنؔ
بے کرم نعت لکھ رہا ہوں میں

اعجاز روشن

نعتؐ

سید تحسین گیلانی

مدحتِ سرکار دل میں جاں گزیں بچپن سے ہے
نور کی اِک لو رگِ جاں میں کہیں بچپن سے ہے

شکمِ مادر سے سنی ہیں مصطفیؐ کی لوریاں
ہیں مرے دل میں مکیں، ان پر یقیں، بچپن سے ہے

جب بھی دیکھا چاند کو تو ہم یہ کہتے تھے سنو
"چاند سے پیارا نبیؐ وہ دل نشیں، بچپن سے ہے"

جب قلم تھاما تو پہلا نام لکھا آپؐ کا
ذکرِ خیر المرسلینؐ دل میں نگیں، بچپن سے ہے

ماں نے قصے تھے سنائے گود میں حسنینؓ کے
ان کے نانا کی شبیہ دل میں مکیں، بچپن سے ہے

منبر و محراب کا جو حسن ہے اپنی جگہ
ان کی چوکھٹ پر جھکی اپنی جبیں، بچپن سے ہے

نعتؐ

نگاہوں میں چمکتا ہے یہ منظر سبز گنبد کا
مرے دل میں دمکتا ہے یہ منظر سبز گنبد کا

بہارِ جاں فزا کہیے نگارِ دل ستاں کہیے
خیالوں میں مہکتا ہے یہ منظر سبز گنبد کا

ریاضِ جاں میں کھلتے ہیں حسیں موسم گلابوں کے
بہشت آثار لگتا ہے یہ منظر سبز گنبد کا

خدا کے نور کے جلوے فرازِ طور کے لمحے
یہ ہر لحظہ نکھرتا ہے یہ منظر سبز گنبد کا

طلوعِ فجر کا منظر جہاں بھر سے سہانا ہے
عجب صورت سنورتا ہے یہ منظر سبز گنبد کا

مہک اٹھتی ہے جذبوں سے حرائے جاں کی تنہائی
بصد نکہت ابھرتا ہے یہ منظر سبز گنبد کا

سرورِ قلب وسینہ ہے تجلی ان فضاؤں کی
قرارِ جاں ٹھہرتا ہے یہ منظر سبز گنبد کا

جھڑی آنکھوں سے لگتی ہے گنہ کے میل دھلتے ہیں
کرم بن کر برستا ہے یہ منظر سبز گنبد کا

اسی کی چھاؤں میں نوریؔ پیامِ موت آ جائے
کہ دل بن کر دھڑکتا ہے یہ منظر سبز گنبد کا

محمد ظفر اقبال نوری

نعتؐ

ہوائے شہرِ محبت میں رہنا چاہتا ہے
چراغِ شوق مدینہ میں جلنا چاہتا ہے

حضور اپنا رُخِ ضوفشاں دکھا دیجے
کہ میرا مہرِ عقیدت چمکنا چاہتا ہے

عطا ہو اذنِ مسرت تو میرا دل بھی حضور
اداس راتوں کی زد میں نکلنا چاہتا ہے

حضور آپ سے ملنے کی آرزو میں فقیر
فصیلِ جسم کے اُس پار اُترنا چاہتا ہے

مثال آپ کی ذاتِ کمال کی لے کر
یہ عہد اپنی بھی تہذیب کرنا چاہتا ہے

عطا کریں جو اجازت تو اس کو ہمت ہو
امیرؔ آپ کی تعریف کرنا چاہتا ہے

احمد امیر پاشا

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اک سرسری نگاہ میں گُل رنگ ہو گئے
پست و بلند، دشت و جبل، ژاژ و بن تمام

عقیدت

تکریمِ رسالت مِرے ایمان کی تابش
تکریمِ رسالت گُلِ عرفان کی تابش

تکریمِ رسالت سے حسیں خیمۂ افلاک
تکریمِ رسالت پہ فدا ہر دلِ بے باک

تکریمِ رسالت سے ہیں ایمان کے انوار
تکریمِ رسالت سے ہیں افلاک ضیا بار

تکریمِ نبیؐ حاصلِ قرآنِ مُبیں ہے
تکریمِ نبیؐ جلوۂ فردوس بریں ہے

تکریمِ رسالت سے ہے ہر پھول میں خوشبو
تکریمِ رسالت سے رواں نعرۂ حق ھُو

یہ بات مِری غور سے سُن خُوگرِ توہین
تکریمِ نبیؐ ہے مِرا ایمان مِرا دین

تکریمِ رسالت مِرے افکار کی مہکار
تکریمِ رسالت میں نہاں خُلد کے اَسرار

توہینِ نبیؐ دہر میں تاریک فضا ہے
یہ شہرِ ضلالت ہے حماقت کی ہوا ہے

تکریمِ نبیؐ خاتمِ دوراں کا نگیں ہے
تعظیمِ محمدؐ سے ہر اِک لمحہ حسیں ہے

ہم غازی، مجاہد بھی، دِلاور بھی بنیں گے
گستاخِ رسالت کو تہہِ تیغ کریں گے

تکریمِ نبیؐ حکمِ خداوندِ جہاں ہے
تکریمِ نبیؐ عظمتِ انساں کا نشاں ہے

تکریمِ رسالت کے محافظ ہیں مسلماں
تکریمِ رسالت ہے بقائے دلِ دوراں

تکریمِ رسالت سے ہے ہر قوم کی تکریم
اِس نور کی تابش سے ہے ہر فرد کی تعظیم

شاہ محمد سبطین شاہجہانی

مرے آقاؐ

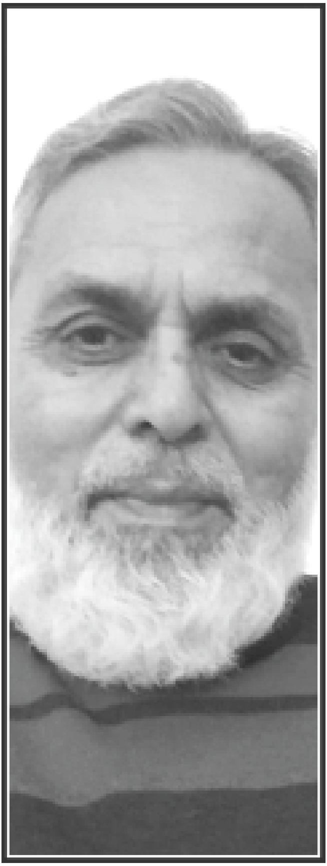

اے کمالِ حُسن، اے حُسنِ کمال
آپؐ تصویرِ جمالِ ذوالجمال

رحمۃ للعالمینؐ آپؐ کی
ماورائے فکر و ادراک و خیال

اے سخی الاسخیاء رشکِ عطا
آپؐ سے ہے ہر سوالی کا سوال

جو تجھے محبوب ، وہ محبوبِ کُل
اے مرے آقا، اے آقائے بلالؓ

وہ سپہ سالار ہیں غزوات کے
اُن کا ہر اک لشکری ہے اُن کی ڈھال

میں نے آقاؐ کو نہیں دیکھا اِنیس
شُکر ہے، دیکھی ہے میں نے اُن کی آل

محمد انیس انصاری

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

گُل بن دیارِ علم کے پیروں کی گرد تھے
اک رنگ میں چنار ہوئے خاربن تمام

عقیدت

انصر حسن

دشتِ بلا میں ایک سفینہ نجات کا
نادم ہے جس کو دیکھ کے پانی فرات کا

ہائے جفا کی تیغ سے مارا گیا جسے
مرکز تھا وہ حُسین خدا کی صفات کا

مولا علی کا لال ہے زہرا کا چین ہے
رستا دکھا رہا ہے جو موت و حیات کا

میرا حُسین دینِ پیمبر کی آبرو
تیرا یزید لاڈلا لات و منات کا

اہلِ وفا کا چین سے رہنا محال ہے
دنیا نہیں مقام سکون و ثبات کا

لگتا یہی ہے مادرِ اصغر تھی سامنے
دامن ہلا رہی تھی جو کالی قنات کا

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

پا آبلہ نے اُٹھ کے خس و خار چن لیے
رہ دیکھتے ہی رہ گئے سرو و سمن تمام

عقیدت

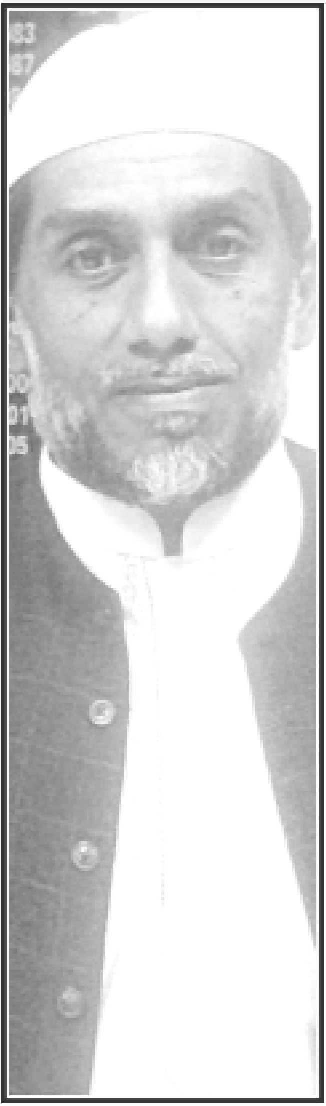

غلام، آقا کو اپنے کر رہے ہیں یاد صدیوں سے
سجائی جا رہی ہے محفلِ میلاد صدیوں سے

ہماری ہے شہِ کونین سے فریاد صدیوں سے
وہ، محتاجوں کی ہیں فرمارہے امداد صدیوں سے

یہ توحید و رسالت ، لازم و ملزوم ہیں باہم
بحمد اللہ، یہ نعرے ہیں زندہ باد صدیوں سے

خدا ہی جانتا ہے کتنی عظمت مصطفٰی کی ہے
وہ ہیں روحِ روانِ عالمِ ایجاد صدیوں سے

یہ پندرہ سو برس کا عرصہ بھی تھوڑا نہیں لیکن
ولادت سے مزیّن ہے جہاں آباد صدیوں سے

بفیضِ نسبتِ حسانؓ ، جبریلؑ امیں مجھ کو
نبی کی نعت پر، دیں ہیں دعا و داد صدیوں سے

کہانی اُن کی رحمت کی بہت فیضانؔ لمبی ہے
لبِ ہستی پہ ہے میلاد کی رُوداد صدیوں سے

فیض رسول فیضان

عقیدت

خدا نے بخشا ہے اُن کو مقام کیا، سوچو
عطا کیا نہیں کوثر کا جام کیا، سوچو

مقامِ قربِ خدا خاص ہے انھی کے لیے
خدا کے ساتھ نہیں ان کا نام کیا، سوچو

ادب ہے شرط بڑوں کا تو چھوٹوں پر شفقت
محبتوں کا وہ لائے نظام کیا، سوچو

دوئی کی فکر نہ تثلیث کی تمنا ہے
پلایا اس نے ہے وحدت کا جام کیا، سوچو

نبی کے روپ میں رحمت خدا کی اتری ہے
"نبی سے قبل تھا رحمت کا نام کیا، سوچو"

نبی سے قبل کہیں تھی یہ ماؤں کی عظمت
کہیں تھا بیٹیوں کا احترام کیا، سوچو

نبی کی فکرِ ابد آشنا سے ہٹ کے بھلا
کسی کی فکر نے پایا دوام کیا، سوچو

نوید نعت کہو تم بھی مثلِ بوصیری
وہ نعت کہہ کے ہوا نیک نام کیا، سوچو

نوید عاجز

صدر العُلیٰ

صراطِ حق پہ جہاں ابتداء محمدؐ ہیں
ہوں میں جہاں بھی مری انتہا محمد ہیں

وہ اولیں ہیں وہی آخریں کہ ہستی کا
وہ جن سے ظاہر و باطن سجا محمد ہیں

جمالِ صورت و معنی بنا کے کامل تر
وہ جس پہ ناز کرے کبریا، محمد ہیں

تمام اُن پہ ہیں اخلاق کے مکارم سب
کہ اوجِ رفعتِ صدق و صفا محمد ہیں

لسان و قلب و نظر مانگتے ہیں اُن سے حیات
کہ بحرِ بخششِ آبِ بقا محمد ہیں

ہیں اُن کے دم سے کھلے عفو و صلح دامن کے پھول
بہارِ عالمِ حُبّ و وِلا محمد ہیں

الست جس سے منور ہر بزم روشن
وہ شمعِ محفلِ قالُوا بلیٰ محمد ہیں

کہیں ہم احمد و محمود انھیں بھلے حماد
وہ جس سے حمد نے پائی جلا، محمد ہیں

یہ کائنات ہے کُن سے وجودِ حمد اگر
وجودِ حمد میں روحِ ثنا محمد ہیں

کھلے گا حمد کا پرچم نہ کوئی گھبرائے
کہ آج شافعِ روزِ جزا محمد ہیں

ہیں انبیاء، شہداء، صالحیں کہ صدیقیں
وہ جس کی ضو سے ہے سب کی ضیا محمد ہیں

خلوص و جذبہ و کردار سب کے مُنعم نے
جسے ہے منبعِ نعمت کہا، محمد ہیں

نہ ہے غضب کوئی اس پر نہ ہوگا وہ گمراہ
کہ جس کے حامی و حاجت روا محمد ہیں

لکھے کسی کے لیے جو بھی ربّ لوح و قلم
رضائے کاتبِ قدر و قضا محمد ہیں

قسم ہے اُس اَرِنِیْ اور لن ترانی کی
وہ جس نے دیکھی ہے ذاتِ خدا، محمد ہیں

ہے تاجِ ختمِ نبوت انھی کے سر پہ سجا
کہ بزمِ حق میں شہِ انبیاء محمد ہیں

جو میری فکر کو دیتے ہیں روشنی آصف
وہ حرفِ صَلِّ وَسَلِّم علیٰ محمد ہیں

مرزا آصف رسول

رباعیات

ہے صورت حال کا کسے اب احساس
بیکاری ، بیماری ، غمخواری ، افلاس
کھائیں گے گھاس اور بنائیں گے بم
بم بن گیا کھا رہے ہیں لوگ اب بھی گھاس

....

کچا مفتی تھا اور فتویٰ بھی خام
گویا کھیتی تھی اپنے گھر کی اسلام
باتقویٰ ماہ دیں ضیاء الدیں نے
کر ڈالی چاندنی بھی جس تس پہ حرام

....

تم سے سبھی پایندہ و آباد اسلام
از بس اس کام سے کمایا بھی ہے نام
مکہ نہیں! یہ شہر ہے اسلام آباد
حجاج کرام! اب تو کھولو احرام

....

ہے اہلِ سیاست کو سیاست سے کام
باکم بصری کتنی بھی گہری ہو شام
کرتے چلے آتے ہیں سمجھ کر ووٹر
بیٹھے ہوئے گتے کو بھی جھک جھک کے سلام

....

دل میں ابلیس اور زباں پر قرآن
وریک کم صد یہاں ہیں قاری رمضان
بچوں کے ساتھ فعلِ بد مسجد میں
یہ پاکستان ہے کہ ناپاکستان

....

کس کس نے کہا حلال ہے مال حرام
اچھا لگتا نہیں کسی کا لوں نام
لے گا تو نام سب کے اے ان کے وکیل
"ما أنت وما أنا و تِلک الایام"

....

ہیں ملیا میٹ شہر ، گاؤں تاراج
اس پر بھی لٹے پٹوں سے جاں گیر خراج
سن سینتالیس سے ہے یوں اب سے نہیں
نگری اندھیر راجہ چوپٹ کا راج

....

تھی بے کس و بے بس، تھے لٹیرے مُنہ زور
جاں جانے کا ڈر بھی تھا، مچایا نہیں شور
تھا ڈر سے چھُپن شہر بھر میں ورنہ
سُستی کو خبر ہے کس نے لوٹا جھنجھوڑ

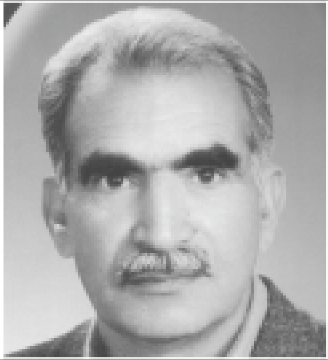

محمد ارشاد

رباعیات

پاکیزہ برو بارِ زمیں کھاتے تھے
مشکوک ہو جو لقمہ نہیں کھاتے تھے

اے مرغِ مسلم کے فدائی مسلم
اسلاف ترے نانِ جویں کھاتے تھے

....

ہر سبز چراگاہ میں چر سکتے ہیں
جب چاہیں شکم شوق سے بھر سکتے ہیں

کیا پیٹ کی پوجا ہے بشر کی منزل
یہ کام تو حیوان بھی کر سکتے ہیں

....

کیا تھا وہ سفر صرف سفر کی خاطر
بلکہ تھا وہی خیر و خبر کی خاطر

معراجِ محمد سے یہی درس ملا
گردوں ہوا تسخیر بشر کی خاطر

....

خوش خلق و خوش اطوار ملائے اللہ
خدمت کے پرستار دکھائے اللہ

بنتے ہیں یہ اکثر ہی سبب خفت کا
نادان مشیروں سے بچائے اللہ

اللہ کے ہی اسم سے آغاز کریں
اکرام و عنایات کا در باز کریں

وہ ذات ازل سے ہے جو رحمان و کریم
اس کے ہی کرم سے سخنِ اعجاز کریں

....

کہہ دو دل و جاں سے کہ احد ہے اللہ
ہرگز نہیں محتاج صمد ہے اللہ

دیکھیں ذرا اس کی احدیت پہ ثبوت
والد ہے کسی کا نہ ولد ہے اللہ

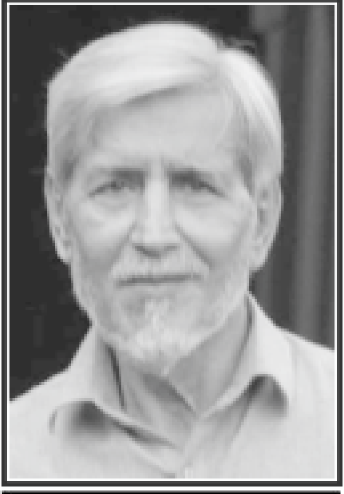

گلزار بخاری

رباعیات

اے حرف کشو گہر فشانی کر لو
ضو پاش رخِ عکسِ معانی کر لو
میں بانٹ رہا ہوں کاغذی چاند کی دھوپ
ارضِ سخن اپنی آسمانی کر لو

بے رنگ یہ نقشِ زندگانی کر لو
تصویر سے پھر نقل مکانی کر لو
آزاد کرو قیدِ بدن سے تقدیر
وا دیدۂ رازِ جاودانی کر لو

روشن دلِ دردِ آشیانی کر لو
خورشید تلک نور رسانی کر لو
جب تھام لو تسلیم و رضا کی رسی
تقدیرِ خدا پہ حکمرانی کر لو

غم سوز ادا سے سرگرانی کر لو
کچھ دیر تو عیشِ ناگہانی کر لو
اے جبر گزیں حسینہ بوسہ فروش
اک جام سے غم کی شادمانی کر لو

ظرفِ نظر اپنا آسمانی کر لو
خورشید و قمر پہ حکمرانی کر لو
خود صورت آئینہ ہو جاؤ گے تم
آئینہ بدر صورت فانی کر لو

آشوبِ یقیں سے بدگمانی کر لو
لیکن شک سے یقیں دہانی کر لو
سائے سے صورتیں بنیں گی کیا کیا
ہر وہم کو آئینہ مکانی کر لو

الفاظ سے آزاد کہانی کر لو
کردار کو تصویرِ معانی کر لو
یہ چشم و ابرو بھی غزل کہتے ہیں
خاموش نوا کو داستانی کر لو

آغوش میں دریا کی روانی کر لو
پیدا دامن میں بے کرانی کر لو
رکھ دو کسی خواب میں ترستی آنکھیں
بیدار بڑھاپے میں جوانی کر لو

محمد نصیر زندہ

رباعیات

اب دیپ ہے میرا نہ ہوا میری ہے
اب بستی میں حالت ہی جدا میری ہے
یہ خواب نہیں میرے مطابق میرے
اک شخص کے قبضے میں انا میری ہے

....

ان چاند ستاروں کی کہانی ہے جدا
حالات کے ماروں کی کہانی ہے جدا
دیوار کے سائے کو کہاں ہے معلوم
دریا کے کناروں کی کہانی ہے جدا

....

وحشت مری پہچان ہوئی جاتی ہے
اب زندگی آسان ہوئی جاتی ہے
عالم کے بکھیڑوں سے ملی مجھ کو نجات
فطرت مری مہمان ہوئی جاتی ہے

....

دکھ درد کے اظہار کا موقع نہ ملا
محبوب سے گفتار کا موقع نہ ملا
شاید کوئی صورت نکل آتی لیکن
دربان سے تکرار کا موقع نہ ملا

....

گلشن کی ہوا دیر سے مجھ تک پہنچی
پنچھی کی صدا دیر سے مجھ تک پہنچی
کھڑکی میں مری سوکھ چکے تھے سب پھول
ساون کی گھٹا دیر سے مجھ تک پہنچی

اطراف جو پاگل ہے ہوا ، بھوکی ہے
باسی رہے ہم جس کے ، فضا بھوکی ہے
اب بھاگ کے جائیں تو کدھر جائیں ہم
یہ دھرتی بھی مانندِ خلا بھوکی ہے

....

روتے ہیں کسی کام سے پہلے پہلے
اک رنج ہے آرام سے پہلے پہلے
یہ کون سی بستی ہے ، ہر اک کھڑکی میں
جلتا ہے دیا شام سے پہلے پہلے

....

ٹوٹا ہوا اک خواب ہے دروازے پر
جلتا ہوا مہتاب ہے دروازے پر
بھٹکی ہوئی خاموش صداؤں کا یہاں
اُمڈا ہوا سیلاب ہے دروازے پر

سعید اشعر

قطعات

اگر کچھ مچھلیاں پھینکے سمندر میری کشتی میں
پھر اس کے بعد گل ہو جائے شمع زندگی اپنی
دلاور نے کہا تھا ٹھیک ہی اے آفتاب عالم
"سمندر کو دکھانا چاہیے دریا دلی اپنی"

....

چیزوں کے دام کوہ سے اونچے نکل گئے
راشن لیا تو جان پڑی اضطراب میں
تازہ بجٹ کے بعد سبھی لوگ کہہ اٹھے
"آرام سے ہے کون جہانِ خراب میں"

....

آپ جب ہیں مرے نئے ابا
چاہ سے کام کیوں نہیں لیتے
بیر اور ککڑیاں کھلاتے ہیں
آپ یہ آم کیوں نہیں لیتے

....

میرے مولا سرخرو کر عقدِ ثانی میں مجھے
اس سے شادی کر ہی لوں گا جس کا دلدادہ ہوا
جب کیا اس کے حوالے میں نے اپنا اے ٹی ایم
"تب وہ میرا ہمسفر بننے پر آمادہ ہوا"

مرزا آسی اختر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

مجھ پہ ترے غم کا سائبان رہا ہے
دشت میں بھی سر پہ آسمان رہا ہے

ہائیکو

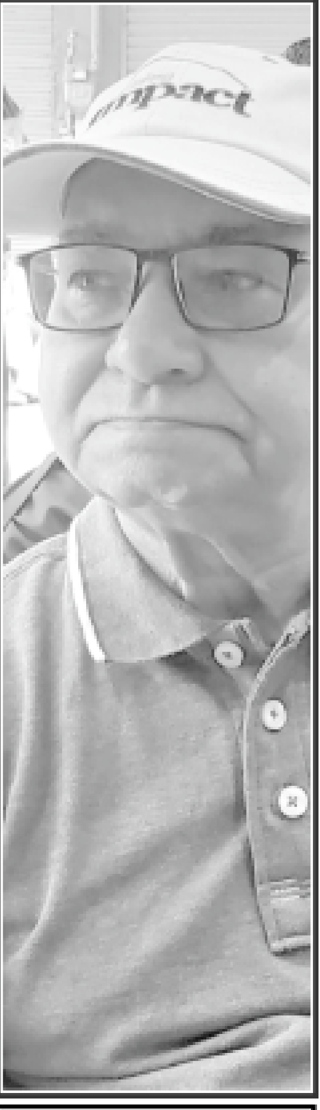

اجمل اعجاز

ہرنی جیسی چال
نظریں الجھی پاؤں میں
ہوا میں اڑتے بال

....

ہاتھوں میں ہیں ہاتھ
برکھا رت بھی ساتھ آئے
میں ساجن کے ساتھ

....

ہاتھوں میں شمشیر
فاتح بن کر لوٹیں گے
آؤ چلیں کشمیر

....

عرض کریں احوال
آنکھیں رخ سے ہٹ جائیں
سرخ ہوئے ہیں گال

....

اک سپنوں کا باغ
میں نے اک تتلی پکڑی ہے
ہاتھوں میں ہیں داغ

وطن کے لیے گیت

اے ارضِ سمن زار، مری ارض سمن زار

غازے سے نہیں چہرہ دمکتا ہے لہو سے
یہ خاک پھٹی جاتی ہے اک ذوقِ نمو سے
سینچا ہے شہیدوں نے اسے اپنے لہو سے
یونہی تو نہیں تیری ہر اک راہ ہے گلبار
اے ارض سمن زار، مری ارضِ سمن زار

سبزے کی تراوٹ میں ہے دہقاں کا پسینہ
ہر قطرے کے موتی سے ہے ہر پھول نگینہ
دل کھول نچھاور کیا تو نے یہ خزینہ
رنگوں سے دہکتے ہوئے تیرے یہ مرغزار
اے ارض سمن زار مری ارضِ سمن زار

یہ جھاگ اڑاتے ہوئے دریاؤں کے دھارے
ست رنگے یہ کھلتے ہوئے پھول ان کے کنارے
یہ پھول ہیں یا رنگوں کے صد رنگ شرارے
اور گیت سناتے ہوئے جھرنوں کی یہ جھنکار
اے ارض سمن زار مری ارضِ سمن زار

راجہ عبدالقیوم

پاکستان کا پرچم [یومِ یکجہتی کے تناظر میں]

بہارِ جلوۂ عرفان پاکستان کا پرچم
گلابِ گلشنِ قرآن پاکستان کا پرچم

غم و آلام اس کو دیکھنے سے دور ہوتے ہیں
ہمارے درد کا درمان پاکستان کا پرچم

ہوئی سیراب اس سے مزرعِ اسلامیاں کیا کیا
مثالِ چشمۂ فیضان پاکستان کا پرچم

محمدؐ کے کرم سے اور علیؑ کی چشمِ رحمت سے
بلند اقبال ہے ذیشان پاکستان کا پرچم

طہارت کے گہر اس میں تقدس کے شجر اس میں
ہے باغِ تقویٰ و عرفان پاکستان کا پرچم

ہماری ذات ہے ممتاز اس کے دم سے دنیا میں
ہماری ذات کی پہچان پاکستان کا پرچم

زہے قسمت عطائے صاحبِ معراجؐ یہ جھنڈا
سراپا رحمتِ رحمان پاکستان کا پرچم

محمدؐ مصطفیٰ کی چشمِ رحمت کا تصدق ہے
خدا کا ہم پہ ہے احسان پاکستان کا پرچم

انوکھی اس کی خوشبو ہے نرالا چاند تارا ہے
فروغِ سنبل و ریحان پاکستان کا پرچم

کتابِ شب کو اوراق پریشاں کر دیا جس نے
سحر کا دلنشیں عنوان پاکستان کا پرچم

سکون و امن کا ناشر ہے امصارِ زمانہ میں
محبت کا حسیں عنوان پاکستان کا پرچم

پیامِ عافیت کا ہے پیامی فضلِ ربی سے
عروجِ شوکتِ انسان پاکستان کا پرچم

شاہ محمد سبطین شاہجہانی

میرے نزدیک یہ جملہ جواہر کا مرقع ہے
فروغِ نیلم و مرجان پاکستان کا پرچم

فضائے سبز سے سرسبز کرتا ہے خزاؤں کو
عجب ہے چشمۂ فیضان پاکستان کا پرچم

سلامی دے رہا ہے ہر کوئی حُسنِ عقیدت سے
کھڑا ہے صورتِ سلمان پاکستان کا پرچم

ڈرا سکتی نہیں ہیں بے سروسامانیاں مجھ کو
مری ہستی کا ہے سامان پاکستان کا پرچم

کہیں عقل و خرد کی گتھیاں اس سے سلجھتی ہیں
کہیں دِل ہے کہیں ہے جان پاکستان کا پرچم

مکمل اتحادی ، اتفاقی ہے ، وفاقی ہے
چمن اندر چمن یک جان پاکستان کا پرچم

ہمیں سبطین بخشا ہے خدا نے اپنی رحمت سے
فلک آثار ، عالی شان پاکستان کا پرچم

ایسے بھی کبھی ہوتا ہے

محرم کے عشرے کا آخری روز تھا اس دن گرمی بھی بہت تھی۔ ہوا چل تو رہی تھی لیکن اس میں تپش اتنی تھی جسے برداشت کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ میں نے کتاب کو چھوڑا اور کمرے کے دروازے کو بند کر کے کولر کے اور نزدیک ہو گیا تاکہ آگ برساتی اس گرمی سے بچا جا سکے لیکن کہاں۔ اس بے سکونی کے عالم میں مَیں نہ جانے کن لایعنی سوچوں میں گم تھا کہ اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی جو کہ اندر سے بند تھا۔ میں فوراً اُٹھا اور دروازے کے اندر کی کُنڈی کو کھول کر جب پٹ کو وا کیا تو دیکھا کہ باہر میری چھوٹی بیٹی کھڑی تھی، جسے دیکھ کر میں بہت حیران ہوا اور اسی حیرانی میں نے کہا۔

بیٹی تم۔ اتنی گرمی۔ اور پھر تم نے اپنے آنے کی اطلاع بھی نہیں دی۔ آؤ اندر آ جاؤ۔ باہر بہت گرمی ہے بیٹی نے اندر داخل ہو کر پہلے مجھے سلام کیا، پھر میں نے اُس کے سلام کا جواب دینے کے بعد اُس کے سر پہ ہاتھ رکھ کر پیار دیا۔

''ابو بس اچانک پروگرام بن گیا آنے کا۔ میں نے سوچا کہ کیوں نا میں اپنے بیٹے کی قبر کو لیپ پوت آؤں۔ بس سے اُتر کر پہلے میں قبرستان گئی۔ بیٹے کی قبر کو سنوارا۔ اب میں یہاں ہوں۔

یہ اس کا پہلا بچہ تھا جو ہمارے ہاں پیدا ہوا تھا۔ ماں باپ کے گھر میں ہمارے معاشرے میں یہ ریت تھی کہ بیٹی کا پہلا بچہ اُس کے میکے گھر ہو۔ چنانچہ اس بچے کی پیدائش بھی اس ریت کے مطابق اس کے میکے یعنی ہمارے گھر ہوئی تھی لیکن شومیٔ قسمت ہے یہ بچہ چند گھنٹے ہی جیا پھر اللہ کو پیارا ہو گیا۔

''چلو اچھا کیا۔ اپنے بیٹے سے مل کر آئی ہو۔ میں نے لبریز آنکھیں صاف کرتے ہوئے کہا۔ جب وہ میرے پاس ہی کرسی پر بیٹھ گئی تو میں نے پوچھا۔ ''تمھارے تینوں بچے تو ٹھیک ہیں ناں بیٹے؟

حنیف باوا

ہاں جی اللہ کا شکر ہے۔ سب ٹھیک ہیں۔"
تھوڑے سے توقف کے بعد پھر گویا ہوئی۔
ابو ابو، بھائی اکبر گھر پہ ہیں؟"
"نہیں بیٹے وہ دکان پر ہی ہیں ابھی گھر نہیں آئے۔ میں فون کر کے تمھارے آنے کی اطلاع دیتا ہوں۔ جب میں نے کال کر کے اُسے بتایا کہ اکبر تمھاری چھوٹی بہن فاخرہ آئی ہوئی ہے۔ جلدی گھر پہنچو۔
"اچھا" اس نے بے رُخی سے جواب دیا۔
اُس کی اس بے رُخی کی وجہ شاید وہ چپقلش ہو جو ایک شادی میں میرے داماد یعنی فاخرہ کے خاوند اختر اور میرے اس بیٹے کے مابین ہوئی تھی۔ وجہ کوئی بھی تھی۔ میں اس وقت اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا۔ ہاں اتنا ضرور عرض کروں گا کہ میری اس بیٹی کا کوئی قصور نہیں تھا۔ وہ اس معاملے میں غیر جانبدار رہی تھی۔ اس جھگڑے میں اس نے کسی بھی فریق کی حمایت یا مخالفت میں کوئی لفظ نہیں کہا تھا ہاں اس کا تھوڑا بہت جھکاؤ اپنے بڑے بھائی کی جانب ضرور تھا لیکن اُس نے اپنے کسی بھی عمل سے اس جھکاؤ کو کسی پر بھی ظاہر نہیں ہونے دیا تھا۔ اس کے دل میں اپنے اس بڑے بھائی کے لیے کتنا احترام تھا، کتنا پیار تھا آپ اس بات سے بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں جو میں ابھی آپ کے گوش گزار کرنے جا رہا ہوں۔

اُس وقت میرے پاس سات مرلے کا گھر تھا جو میں نے خود سے نہیں بنایا تھا بلکہ میرے والد کی جانب سے میرے پاس آیا تھا۔
اب جب مجھے اس وراثت کو میرے دو بیٹوں میں تقسیم کرنے کا مرحلہ آیا تو پہلے میں نے اپنی تین بیٹیوں سے پوچھا کہ کیا وہ اس سات مرلے کے گھر میں حصہ دار بننا چاہ رہی ہیں۔ ان تینوں میں دو بڑی بیٹیوں نے صرف اتنا کہا کہ "نہیں"۔ لیکن میری اس چھوٹی بیٹی نے جو کہا وہ ذرا سنیے۔ ابا جی میں بھلا اپنے بھائیوں سے اپنا حصہ لے کر کسی غیر کو کیوں دوں۔" یعنی اس نے اپنے خاوند کو بھائیوں کے مقابلے میں غیر سمجھا۔
بھائی اور والدین نے اس قدر پیار کرنے والی چھوٹی بہن اور میری چھوٹی بیٹی بیٹھک میں میرے ساتھ محوِ گفتگو تھی کہ اتنے میں میرا بیٹا یعنی اس کا بڑا بھائی آ گیا۔ جسے دیکھتے ہی بیٹی کہنے لگی۔
"لو بھائی آ گئے۔"
لیکن بھائی نے بیٹھک کے بیرونی دروازے کے ساتھ ایستادہ نیم کے پیڑ کے ساتھ اپنی موٹر سائیکل کو کھڑا کیا اور ایک نظر بیٹھک کے اندر ڈالتے ہوئے گھر کے دوسرے دروازے سے گزر کر اندر چلا گیا

اور بہن دیکھتی رہ گئی۔ اس کے چہرے پر بھائی کو دیکھ کر جو رونق آ گئی تھی وہ فوراً کافور ہوگئی۔ بھائی کے اس روکھے رویے کو دیکھ کر اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں، تو جب وہ آنسو ٹپک کر نیچے گرنے لگے تو فوراً اس نے اپنی بھیگی آنکھوں کو دوپٹے کے پلو سے صاف کیا اور کہنے لگی۔

اچھا ابو جی اب میں چلتی ہوں۔"

بیٹا کھانا تو کھاتی جاؤ دوپہر کے کھانے کا وقت ہے" میری آنکھیں بھی بھر آئیں۔

نہیں ابا جان۔ اب میں اس گھر کا کھانا کیسے کھاؤں جس گھر کا کھانا میرے بھائی نے میرے سر پہ پیار کا ہاتھ نہ رکھ کر میرے لیے بند کر دیا ہو۔ اب میں یہیں کسی ریڑھی والے سے دو نوالے لے کر زہر مار کر لوں گی۔"

اپنی بڑی بہن نسرین کے ہاں بھی نہیں جاؤ گی۔" جو ہمارے گھر کے قریب ہی رہتی ہے۔

نہیں ابو۔ جب بھائی کے گھر کا کھانا میرے نصیب میں نہیں تو بھائی کے گھر کو چھوڑ کر بہن کے ہاں کا کھانا کیسے کھاؤں۔" یہ کہتے ہوئے وہ اٹھی اور میرے گلے لگ کر رونے لگی۔ بیٹی کو اس حالت میں دیکھ کر اس کے سوا اور کچھ بھی نہ کہا گیا۔

اچھا بیٹے۔ خدا حافظ۔ میری دعا ہے کہ تو اپنے گھر میں سدا سکھی رہے۔ اتنا کہنے کے بعد میں نے اُسے پیار کیا۔ اور جیسے ہی میرا ہاتھ اُس کے سر سے پرے ہوا تو وہ بیٹھک چھوڑ کے باہر نکل گئی۔ مجھ سے بھی رہا نہ گیا۔ میں بھی اپنی کرسی سے اُٹھا اور بیٹھک کی دہلیز پر کھڑا ہو کر اُسے جاتی ہوئی کو دیکھنے لگا۔ میں نے دیکھا کہ وہ جیسے ہی آگے قدم بڑھاتی وہ پیچھے مُڑ کر دیکھتی اور ساتھ ہی چادر سے آنسوؤں سے تر آنکھیں پونچھتی۔ آخر وہ جب گلی کا موڑ مڑی تو میں با دلِ ناخواستہ اندر آیا پھر اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اُس نے اس کڑی دھوپ میں کلمہ چوک پہنچنا تھا جہاں سے اس نے اُس رکشہ پہ بیٹھنا تھا جو لاری اڈے کی جانب جا رہا ہو۔ اڈے پر پہنچ کر اُس نے فیصل آباد جانے والی بس میں سوار ہونا تھا۔ میرے گھر اور لاری اڈے تک کا راستہ اتنا لمبا تو نہیں تھا لیکن اس شدت کی گرمی میں دشوار ضرور تھا۔

لاڈوں سے پالی ہوئی میری بیٹی آج بھائی کے گھر سے بے توقیر ہو کر گئی اُس کا والد اُسے ایک روز کیا ایک پل کے لیے بھی نہیں ٹھہرا سکا۔ کتنا بے بس تھا اُس کا والد بھی۔

اُس کا مجبور باپ
بیٹے کے گھر میں رہنے والا
ہاں۔ ہاں۔ ہاں اپنے بیٹے کے......

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

قیمتی نقصان

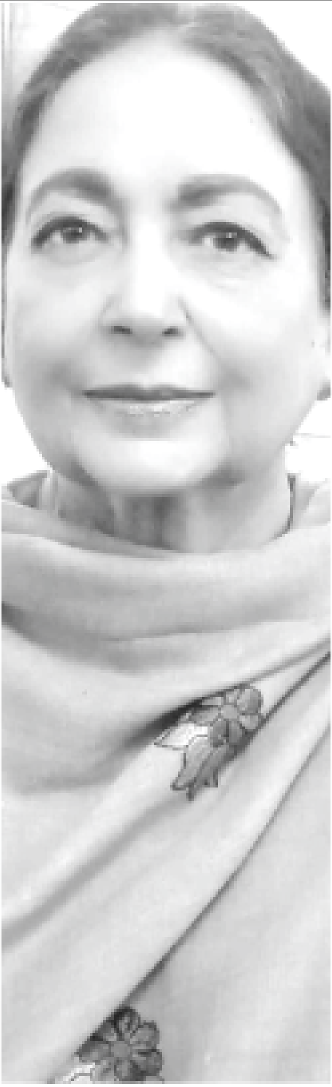

بلقیس ریاض

شادی ہوئے کئی سال بیت گئے تھے.... سجاد بیگ نے اتنی محبت دی کہ وہ اپنے آپ کو خوش نصیب تصور کرنے لگی۔ سجاد کا بزنس .....روپے پیسے کی کمی نہیں تھی....کئی ملکوں کی سیر کر لی تھی....لوگ اس پر رشک تھے.... تین بچے ہوئے اور وقت تیزی سے بھاگنے لگا.... پڑھی لکھی نغمانہ نے تینوں بچوں کی پرورش بہت ہی اعلیٰ کی....دو بیٹے جمیل اور ایان کے بعد اللہ نے بیٹی بھی دی....اللہ کی رحمت گھر بھر میں نہ صرف نازل ہوئی بل کہ قدرت نے اس کا بزنس اور بھی چمکا دیا۔

وقت تیزی سے گزرتا گیا...سجاد نغمانہ کو ابھی تک اپنی محبوبہ کا درجہ ہی دیا ہوا تھا۔ بچے جب اعلیٰ ڈگریاں لے کر پاس ہوئے تو کیوں نہ ہوتے....سجاد نے ان کو باہر کے ملکوں میں اعلیٰ یونیورسٹیوں میں تعلیم دلوائی...... اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ....انھیں بہترین ملازمت وہیں ہی مل گئی دونوں میاں بیوی انتہائی خوش تھے....کہ اللہ نے دولت کے ساتھ ساتھ....بچوں کو پھلتے پھولتے دیکھا .... اور ان کی مرضی سے دونوں بیٹوں کی شادیاں کر دیں .... بیٹی

ابھی چھوٹی تھی.... وہ والدین کی لاڈلی ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک تھی۔ جب اس نے بھی ماسٹرز کر لیا تو اس کی شادی کی فکر ہوئی.... بہت سارے رشتے کزن کے لیے آئے مگر اس کی پسند کو ترجیح دی گئی اور کراچی کے بہت بڑے بیوروکریٹ.... جس کے بیٹے نے سی ایس ایس کیا ہوا تھا... شادی کر دی.... دونوں تنہا رہ گئے.... مگر ہر سال لندن اور امریکہ بچوں کے پاس ضرور جاتے.... بہوئیں اور بیٹے.... خوب خدمت کرتے....

سجاد لاکھوں ڈالرز سے ان کو ہر وہ چیز دیتے جن کی وہ خواہش کرتے.... اسی طرح بیٹی کو بھی خوب نوازتے.... وقت کچھ اور آگے بڑھا سجاد ہارٹ کے عارضہ میں مبتلا ہو گیا تو ڈاکٹرز اس کو بائے پاس کی تجویز دیتے.... مگر وہ بائے پاس کروانے کے حق میں نہیں تھا... بیٹوں نے بہت مجبور کیا تو امریکہ سے اس نے بائے پاس (ہارٹ سرجری) کروالی اور کامیاب رہی۔

دونوں جب زیادہ اداس ہوتے تو بیٹی کو بلوا لیتے.... وہ ان کے ساتھ اچھا وقت گزارتی.... وقت.... کبھی ٹھہرا نہیں....

یوں محسوس ہوتا کہ اس کو پر لگ گئے ہیں اور وہ اڑ رہا ہے۔ شہزاد بزنس میں ابھی بھی بہت مصروف تھا... مگر نغمانہ کے لیے وقت ضرور نکالتا اور شام میں اکثر وہ باہر کھانا کھانے چلے جاتے۔

وقت اور بھاگا اور عمرہ کرتے ہوئے سجاد گر گئے.... بڑی مشکل سے وہ پاکستان واپس آئے.... ان کا کندھے کا آپریشن ہوا اور کئی روز تک اپنے دفتر نہ جا سکے.... صحت ویسی نہ رہی اور دوسری مرتبہ بھی گرے تو سارا بزنس ٹھپ ہو گیا لیکن اللہ کا شکر تھا کہ چل پھر سکتے تھے مگر دونوں کی دنیا ہی اندھیر ہو گئی.... دن بدن وہ چڑ چڑے ہوتے گئے ایک تو عمر کا تقاضا اور دوسرا بچوں کی دوری ان کا مزاج بہت ہی تلخ ہو گیا.... ہر وقت نغمانہ کے ساتھ تلخی سے پیش آتے.... شروع شروع میں وہ برداشت کرتی رہی.... مگر گھر بیٹھ بیٹھ کر اس قدر تلخی آ گئی نغمانہ کی سیدھی بات بھی برداشت نہ ہوتی.... کہاں ہر سال وہ باہر کے ملکوں میں جاتے تھے اور اب سفر کے قابل بھی نہیں رہے تھے.... اکیلے ٹی وی کے سامنے وقت پاس کرنے لگے اپنی بیماری سے خود بھی تنگ آ چکے تھے۔

یہ وہ نغمانہ تھی جس کو سجاد نے بے انتہا محبت دی اور بیوی کے بجائے اسے اپنا دوست سمجھتے تھے مگر.... اب سب کچھ بدل گیا تھا. سجاد کا رویہ دن بدن ویسا نہیں رہا تھا.... سارا دن کاموں میں الجھا ہوا سجاد گھر بیٹھ بیٹھ کر

بور ہو گیا تھا۔ کئی سالوں کے بعد یوٹیوب سے مختلف پروگرام دیکھ کر خوش ہوتے.... نغمانہ جونہی پاس بیٹھتی تو لڑائی ہو جاتی.... غرض کہ نوکروں کی پلٹن اسی طرح گھر میں موجود تھی۔ یہ نغمانہ نے اپنی جوانی میں ایک ڈرامہ دیکھا تھا تو اس کا عنوان تھا..... یہ زندگی وہ نہیں....اب اس عمر میں معلوم ہوا کہ اس ڈرامے کا نام بالکل صحیح تھا۔

تلخی نغمانہ کے دل میں رچ بس گئی تھی.... جو محبت اس نے ساری زندگی نچھاور کی تھی.... وہ.... آہستہ آہستہ کہیں دفن ہو گئی تھی۔ ایک روز زوردار لڑائی ہوئی۔

''تم ہر وقت سر پر سوار رہتی ہو اور احسان جتاتی ہو.... کہ میں تمھارا بہت خیال کرتی ہوں۔

''تم ...اور خیال.....توبہ کرو''۔

میرے ملازمین ابھی بھی وفادار ہیں بہت خیال کرتے ہیں... مجھے تو تمھاری ضرورت ہی نہیں۔

اس لفظ سے نغمانہ کا سر چکرا گیا وہ پھٹی پھٹی نظروں سے اس کو دیکھنے لگی... آنکھوں میں آنسو بھر کر کہنے لگی۔

تو میں چلی جاتی ہوں تم سے تو تمھارے بچے ہی اچھے ہیں۔

ہاں جا سکتی ہو.... میں تمھاری شکل بھی دیکھنے کا روادار نہیں ہوں۔

نغمانہ نے اپنا صندوق پیک کیا اور سجاد کے پاس آتے ہی کہا۔

''میں جا رہی ہوں''.

''ٹھیک ہے جا سکتی ہو.... تم سے تو میرے ملازمین اچھے ہیں...احسان تو نہیں جتاتے''۔

نغمانہ کے پاسپورٹ پر لندن امریکہ کے دونوں ویزے لگے ہوئے تھے۔

وہ ایئرپورٹ جا کر لندن کے لیے ٹکٹ چانس پر دے دی اور کچھ ہی دیر کے بعد اس کی سیٹ کنفرم ہو گئی اور وہ جہاز میں بیٹھ گئی اور بڑی ہی دلبرداشتہ ہو کر وہ لندن پہنچ کر چھوٹے بیٹے کو ایئرپورٹ سے فون کیا۔

میں ہیتھرو ایئرپورٹ پہنچ گئی ہوں آن کر مجھے لے جاؤ۔

واہ امی..... بہت بڑی سرپرائز دی ہے.... بس آدھے گھنٹے کی ڈرائیو ہے۔ فوراً پہنچ جاؤں گا۔

جمیل.....راستے میں ماں سے کہہ رہا تھا میں آج آپ کو دیکھ کر بے حد خوش ہوں.... میرا تو بچپن لوٹ آیا ہے۔

نغمانہ خاموش سی تھی....اور بیٹے کی خوشی کو دیکھ دیکھ کر کچھ نہ کہہ سکی اور جونہی جمیل گھر پہنچا تو بہو عاشی مسکراتی ہوئی گلے لگ گئی۔ خوب صورت گھر دو پیارے پیارے بچے دیکھ کر نغمانہ خوشی خوشی ان کا منہ چوم رہی تھی۔

نغمانہ نے سونا سونا گھر دیکھ کر عاشی سے پوچھا جو ساس کے لیے چائے بنا رہی تھی۔

"گھر میں کوئی ملازم نہیں ہے"۔

"نہیں آنٹی.... ملازم یہاں پہ بہت مہنگے ہیں.... بس کہیں سے کھانا بنوا لیتے ہیں.... تین چار دن کے لیے۔ کبھی کبھی میں جاب سے جلدی آجاؤں تو شام کے وقت بچوں سمیت کھانا باہر کھا لیتے ہیں۔ تجمل اور میں مل کر سارا کام کر لیتے ہیں۔ ہفتہ میں ایک بار صفائی کیلئے نوکرانی آجاتی ہے۔ دوسو پاؤنڈ ایک روز کے دے دیتے ہیں۔ ہمارا اس ویکنڈ پروگرام کینیڈا کے لیے بنا تھا.... بچوں کا سوچ رہے تھے کہ ڈے کیئر میں چھوڑ جائیں گے.... ابھی چار دن پڑے ہیں.... میں ان کی ساری تیاری کھانے پینے کی کر لیتی ہوں.... اچھا ہے بچے اس ویکنڈ ہماری غیر حاضری میں آپ کے پاس رہیں گے.... اچھا تو نہیں لگتا.... آپ آئی ہیں اور ہم چلے جائیں اگر آنے سے پہلے بتا دیتی تو ہم پروگرام نہ بناتے۔ اب ٹکٹ خرید چکے ہیں۔ جہاں جانا ہے اطلاع بھی دے چکے ہیں۔ بہو نے فوراً ایک ہی جست میں ساری حقیقت بیان کر دی۔

تجمل کھسیانہ سا کھڑا تھا.... نغمانہ نے دونوں کی جانب دیکھا بیٹے کو تھوڑی شرم محسوس ہو رہی تھی مگر بہو نے ساس کی بات سنے بغیر ساری حقیقت بیان کر دی بلکہ بچوں کو سنبھالنے کی ذمہ داری بھی ڈال دی۔

وہ بولی۔

آنٹی میں تو شرجیل سے لیٹ گھر آتی ہوں.... یہ شام کو ہی آجاتے ہیں.... اور خوب گھمائیں گے آپ کو.... اتنے عرصے کے بعد آئی ہیں۔

نغمانہ نے اس کی جانب دیکھا تو کوئی جواب نہ دیا۔ بیٹا.... ماں سے پوچھ رہا تھا۔

"میں آپ کو باہر کھانے پر لے جاتا ہوں.... عاشی کا پروگرام سہیلیوں کے ساتھ جانے کا ہے"۔

نغمانہ کا دل کرچی کرچی ہو گیا.... بیٹا ہر وقت کہتا تھا کہ بہت اداس ہوں آپ کے بغیر مگر جونہی وہ آئی تو سو سو طرح کے اپنے پروگرام ان کے بنے ہوئے تھے۔

رات کو شرجیل ایج ورڈ روڈ پر لبنانی کھانا کھلانے کے لیے ماں کو لے گیا... کھانا تو اچھا تھا مگر نغمانہ کا دل ویران ویران سا تھا ایک تو سجاد کو چھوڑ آئی تھی۔ گھر کا آرام جہاں کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں تھی۔ یہاں پر ان کا کوئی ملازم بھی نہیں تھا اور.... اور بچوں کی ذمہ داری اس کے سر پہ

آن پڑی تھی۔
چار دن کے بعد عاشی اور شرجیل چلے گئے اور بچے نعمانہ کی سپردگی میں دے گئے۔
رات کو بچوں نے شور مچانا شروع کر دیا... ماما کے پاس جانا ہے۔ نعمانہ نیند سے بڑبڑا کر ان کو بہلاتی رہی... صبح ان کو ناشتہ کروا کر گھر کے باہر سڑک پار کرتے ہی پارک تھی بگھی میں بٹھا کر ان کو لے گئی.... چپس اور چاکلیٹ کے پیکٹ رکھ لیے.... واجبی سا ناشتہ کر کے آئی تھی بھوک لگی تھی.... پارک کے کنارے ایک چھوٹا سا ریسٹورنٹ تھا... اس وقت کوئی اچھا کھانا تو نہیں مل سکا تھا... ایک پیزا لیا آدھا خود کھایا اور آدھا بچوں کو کھلایا... ابھی تین دن باقی تھے ان کے آنے میں.... نعمانہ... کو... جتنا تنگ کر سکتے تھے انھوں نے کیا... اور شرجیل کے لاکھ اصرار پر وہ مزید نہ رہی؛ صاحب حیثیت خاتون تھی کسی فائیو سٹار ہوٹل میں رہ سکتی تھی مگر بچوں کی الفت اور سجاد کی تلخی نے گھر چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔
دو امریکہ ایان کے گھر پہنچ گئی۔ دونوں نے نعمانہ کو ویلکم خوشدلی سے کہا... اور ایک پاکستانی خاتون سے چار دنوں کا کھانا بنوا لیا.... دونوں تو جاب پر چلے جاتے اور وہ باورچی خانہ میں جا کر من پسند کھانا بنواتی.... جس گھر میں وہ آئی تھی اس کے بیٹے ایان کا تھا۔ یہاں پر بھی دونوں جاب پر جاتے.... اور رات کو واپس آتے.... بچے دونوں بڑے تھے گھر کے باہر بس آن کر انہیں چھوڑ جاتی اور صبح بس سکول لے جاتی.... سارا دن گھر میں اکیلی رہتی۔ رات کو جب تھکے ٹوٹے آتے تو نیند کی آغوش میں چلے جاتے۔
ایان نے سجاد کو بتا دیا تھا کہ ماما امریکہ پہنچ گئی ہے.... سجاد نے اس کے چلے جانے کا ذکر ان سے نہیں کیا تھا... ایک بات سجاد کی اس تلخی میں بھی اچھی تھی کہ بچوں کو یہ معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ ماں روٹھ کر گئی ہے..... کہیں وہ ماں سے محبت سے پیش نہ آئیں۔
ایک دن.... منظر اتنا خوشگوار تھا تو نعمانہ باہر ڈیک پر بیٹھی بیٹے دونوں کو یاد کر رہی تھی.... سجاد بچوں کی پرواہ کیے بغیر امریکہ میں جو دفتر تھا وہاں سے دوپہر کے وقت آتا اسے لے کر اچھے سے ریسٹورنٹ سے کھانا کھاتا اور نعمانہ کو شاپنگ کے علاوہ خوب سیر کرواتا.... وہ ڈیک گھنے سبزے سے گھرا ہوا تھا اور ہوا سے جھومتے درخت.... بادلوں کی مستی.... ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے.... سجاد کی یاد کو دل میں سمائے سوچنے لگی۔ یہ بچے جن کا میں عمر بھر دم بھرتی تھی.... وہ کو کہ تابعدار ہیں.... مگر اپنی اپنی بیویوں کے غلام... پھولوں بھرے درخت کی چھاؤں

میں بیٹھی اداس تھی۔ گھر کا آرام.... گھر کا سکون.... اس کو بار بار یاد آ رہا تھا.... پھر ایک ہفتے کے بعد ایان سے کہا۔

میں واپس پاکستان جاؤں گی.... سوچتی ہوں کہ کرن کو بھی کراچی میں ملتی جاؤں۔

جب کرن کو آنے کے لیے کہا تو اس نے کہا۔

ماما پہلے بتاتی.... میں تو برازیل میں ہوں ہمارا تو ٹرپ نکل آیا ہے۔ پندرہ دن کے بعد برازیل سے آئیں گے۔ تب تک آپ امریکہ رہیں۔

"جو اللہ کو منظور"۔

ایان کو زبردستی کہا کہ میری ٹکٹ کا بندوبست کرے میں نے واپس جانا ہے۔

دوسرے دن واپس گھر پہنچ گئی.... گھر میں ڈرائیور موجود نہیں تھا.... تمام نوکر غیر حاضر تھے۔ اٹینڈنٹ کمرے میں بیٹھا تھا.... سجاد نے آنکھیں موندی ہوئی تھیں۔ ماتھے پہ ہاتھ رکھا تو ماتھا بخار سے تپ رہا تھا۔

نغمانہ نے اٹینڈنٹ سے کہا۔

ان کو بخار ہے دوا نہیں دی۔

بس panadol کھا لیتے تھے۔ ڈاکٹر کو نہیں دکھاتے ہیں۔

ڈرائیور کو اطلاع دی گئی وہ ڈر کے مارے فوراً پہنچ گیا اور نغمانہ سیدھی سجاد کو ہسپتال لے گئی۔ ٹیسٹ ہوئے تو سجاد کو نمونیہ تھا۔

آٹھ دن ہسپتال رہنے کے بعد وہ سجاد کو گھر لے کر آئی تھی۔ باورچی خانہ کا ابتر حال تھا.... ڈائننگ روم کے تمام برتن جو ہر ملک سے خرید کر لائی تھی غائب تھے.... چند پیالیاں باورچی خانہ میں موجود تھیں.... سجاد بڑا نادم سا اسے دیکھ رہا تھا۔

سارا گھر چیزوں سے خالی ہو گیا ہے۔ سجاد نے پیار بھرے لفظوں سے کہا۔

نغمانہ چیزوں کی فکر نہیں.... اس نے محبت سے دیکھتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے.... اور کہا۔

چیزیں تو آ جائیں گی مگر.... تمہارے جانے سے میرا قیمتی نقصان ہو جاتا ہے۔ تم سوچ نہیں سکتی کہ میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں۔ تلخی میں جو کہتا تھا مجھے خود معلوم نہیں ہوتا تھا کہ کیا کہتا ہوں۔ مجھے بہت تکلیفیں ہوتی تھیں تو مجھے سمجھ نہیں آتا تھا کہ میں کیا بول رہا ہوں۔ نغمانہ نے اس کے ہاتھ علیحدہ کرتے ہوئے کہا۔

مجھے گناہگار نہ کرو.... قصور میرا بھی ہے۔ میں کیوں چلی گئی تھی.... وہ محبت بھری نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی.... فضا میں مدھم مدھم موسیقی کی آوازیں نغمانہ کی سماعت میں ٹکرا رہی تھیں۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ وہ جنت میں آ گئی ہے۔

☆☆☆☆☆

''اذان''

وہ بہت دیر سے اپنے گھر کی چھت پر تنہا بیٹھا اس پیغام کو انسان کے لحن میں سننے کا منتظر تھا جسے اذان کہا جاتا ہے...... ایک مرتبہ اپنے ہم جماعت کے ساتھ ناچار جمعہ پڑھنے ایک مسجد میں جا بیٹھا تھا جہاں اس کے ہم جماعت نے جمعہ کی اذان بھی دی تھی...... اپنے دوست کا لحن سن کر وہ کچھ وقت کے لیے ششدر رہ گیا تھا، اس کے تحیر میں دوست کے لیے عقیدت امڈی تھی اور اس لمحے اس نے اپنے دوست کی ٹخنوں اوپر شلوار اور خوب صورت خطی داڑھی کا مذاق بھی نہیں اڑایا تھا...... دراصل مسلمان گھرانے میں پیدائش پانے کے باوجود شہریار نے دینی روایات اور مذہبی اسلوب سے تقریباً طرح ہی دکھائی تھی، دادا ابو نے کلمہ شریف کے بعد اسے پکڑ پکڑ کر جس چیز کی اہمیت اور معنویت سکھانا چاہی تھی وہ اذان اور نماز تھی، جس کی پکار آسمان والے کے حکم سے آتی اور اس سب سے بڑے وجود کی اطاعت کا تقاضا کرتی ہے اور یہ کہ اسے سننا طواف کعبہ سے بھی زیادہ پر فوقیت ہے، اذان ہوتے ہی بیت اللہ کا طواف بھی روک دیا جاتا اور تلاوت قرآن کو موقوف کر کے پورا دھیان اذان کے الفاظ سننے، ان کا جواب دینے اور اذان کے بعد کی دعا پڑھنے کی تاکید پر ہوتا ہے۔ دادا ابو بے چارے اپنے اکلوتے پوتے کو بتا بتا کر تھک گئے تھے... جنھیں سب سے بڑی فکر جوانی کو چھوتے اس نوجوان کی مذہب بیزاری سے تھی، جس کے والدین اس کے دادا کو اس ڈیوٹی پر لگا کہ خود پارٹیوں میں جانا زیادہ اہم سمجھتے تھے جیسے آزاد منش لوگ چوکیدار کو صدر دروازے کی حفاظت سونپ کر نائٹ کلب چلے جاتے ہیں۔ دادا ابو یہی ڈیوٹی روز کرتے تھے۔

پھر...... اچانک ایک دن وہ نوجوان غیر متوقع طور پر مائل بہ مذہب ہو گیا، شاید ہم جماعت اسے متاثر کر گیا تھا وہ اب کم بولنے اور زیادہ سمجھنے لگا...... کہیں کہیں مسجد بھی جانے لگا...... اب اس کا کمرہ بند

فرخندہ شمیم

نہیں ملتا تھا ورنہ کمرے میں رونما ہونے والی خود کیف اکیلی وحشتیں، باہر آنے والی آوازیں انٹرنیٹ کی سحر آفرینی چیٹ انسٹا، تھری ڈی، فلیکس اور کبھی کبھی پورن کا خمار اسے کسی بھی لمحے کچھ اور سوچنے نہیں دیتا تھا......

اب اسے وہ موذن بھی خود بخود ہی اچھا لگنے لگا تھا، جس نے اذان سنا کر گویا اسے کوئی نئی بستی رہنے کے لیے دکھادی تھی.. جس کے کسی بھی مکان کا کوئی کرایہ نہیں تھا۔

اس روز جمعہ تھا اور وہ غسل کر کے مسجد جانے کی تیاری میں تھا...... دادا جان ان دنوں بہت سرشار رہنے لگے تھے...... پوتے میں آنے والا روحانی تبدیلی انہیں پل پل نشاط میں گوندھے ہوئے تھا...... انھوں نے پوتے کو نماز کی تیاری کرتا دیکھ کر ایک پرسکون سانس بھرا اور خود سورہ کہف پڑھنے لگے کہ قران کی یہ سورہ جمعہ کے دن پڑھنا بہت افضل بتایا گیا ہے......

شہر یار تیار ہو کر بیٹھا خطبے کی اذان کا انتظار کر رہا تھا کہ قریبی مسجد سے اذان کی آواز آ گئی...... اسے یاد تھا کہ اذان کے الفاظ سن کر انھیں دہرانے کا حکم اور ختم ہونے پر دعا کی تاکید ہے۔ وہ اذان کے الفاظ دہرانے لگا لیکن ٹھٹھکا گیا...... اسی لمحے کسی دوسری مسجد سے بھی لاوڈ سپیکر پر اذان کی آواز گونجنے لگی تھی...... کیا کرے، کس اذان کا جواب دے...... دونوں طرف سے بیک وقت اذان کی آواز آرہی ہے...... ابھی اس نے اللہ اکبر کا جواب دیا ہے اور باقی جواب دینے ابھی واجب ہیں کہ بنا مہلت حی علی الفلاح کا مقدس پیغام دوسری مسجد سے آ گیا ہے...... جس کا جواب بھی ضروری ہے، وہ بیک وقت دونوں کام کیسے کرے؟

ایک ہی علاقے کی مساجد ہیں دونوں...... کم از کم ایک پیغام تو پورا ہونے دیں...... مقابلے میں کیوں کھڑے ہو جاتے ہیں کہ ہماری مسجد، ہمارے سپیکر اور ہمارے موذن زیادہ سینئر ہیں...... یا اللہ، یہ کیسی مسابقت ہے...... پہلی اذان آخر دوسری مسجد کے کان میں پہنچی ہے ناں... ذرا توقف ہی کر لیتے، دوسری مسجد والے...... پھر تمام مساجد سے اذان کی آوازیں ایک شور کی طرح شروع ہو کر مکمل ہو گئیں...... اب خطبوں کی باری تھی۔ شہر یار دو سے تین ملحقہ مساجد سے ایک ساتھ شروع کیے جانے والے خطبات جمعہ پر کنفیوز ہو گیا۔

اسے تعجب ہوا، جمعہ کا دن تو امت کو یکجا کر کے احکام سنانے کا دن ہوتا ہے...... جمعہ کا مطلب ہی جمع ہونا ہے، اسلامی معاشرت کے تقاضے اور باہمی ذمہ داریوں کو تازہ دم کرنا ہے...... لیکن جمعہ کو مولوی صاحبان کس مقصد کے لیے استعمال کر رہے ہیں..؟ سیاسی گفتگو کے لیے، ناپسندیدہ حکمرانوں کی باتیں کرنے کے لیے، دلوں

میں انتشار برپا کرنے کے لیے، ریاست کے اندر ریاست بنوانے کے لیے...... ان خطبات میں مسلمانوں کو آپس میں اتفاق، امت کو درپیش معاملات، انفرادی زندگی کے فرائض اور اجتماعی زیست کی ذمہ داریوں پر علماء نے بات ہی نہیں کی...... یہ کیسے جمعہ کے خطبات ہو سکتے ہیں؟

....

گڑبڑاتے ذہن کے ساتھ شہریار نے خاموشی اختیار کر لی۔ دادا جان نماز کے لیے نکل رہے تھے، شہریار کو جز بز دیکھ کر رک گئے۔

کیا ہوا شیری بیٹا؟

نماز نہیں پڑھنے گئے؟

کہاں پڑھوں؟ اس کے لہجے میں الجھن تھی

دادا ابو پریشان ہو گئے

ایک مسجد کے باہر بورڈ پر لکھا ہے

مسجد اہل حدیث

دوسری پر لکھا ہے

مسجد اہل سنت والجماعت

ایک دوسری مسجد کے بورڈ پر تحریر ہے

مسجد اہل بیت

دادا جی، اگر نماز ایک ہی ہے، ایک ہی اللہ کے لیے ہے ایک سے الفاظ رکھتی ہے، ایک ہی مقصد عبادت کے لیے ہے تو پھر الگ الگ نام؟

دادا جواب جانتے تھے، مگر چپ رہے

بتائیں ناں دادا

کیا بتاؤں بیٹا، یہ الگ الگ مسلکوں کی کہانیاں ہیں ہر گروہ خود کو درست اور سچا تابع شریعت سمجھتا ہے، دوسروں کو حقیر جانتا ہے، اس طرح مذہب جیسی چیز سے منفی کام لے کر سوسائٹی میں انتشار پھیلاتا رہتا ہے......

تو پھر ایک سادہ مسلمان کیا کرے دادا جان؟

کس کے پیچھے جائے

اور

کس گروہ کی اطاعت کرے؟

کسی کی اطاعت نہ کرے،

دادا قطعیت سے بولے

صرف اپنے اللہ کی اطاعت کرے

کسی بھی مسجد میں جائے، عبودیت کا ماتھا اپنے حقیقی رب کے حضور بچھائے، اور سب سے بڑھ کر اتنا وافر اور تحقیقی علم حاصل کرے کہ کوئی اسے گمراہ نہ کر سکے۔

یہ نظریاتی چپقلش اس لیے کامیاب ہو جاتی ہے بیٹا کہ اسلامی سماج میں رہتے ہوئے بھی عام آدمی کی دینی معلومات بہت کم ہیں بعد میں یہی کم علمی اسے انتہا پسندوں کے ہاتھ کا کھلونا بنا دیتی ہے......

شہریار کسی گہری سوچ میں ڈوبا یکا یک بولا

چلیے دادا، اللہ کی بارگاہ میں چلتے ہیں، اسی سے علم کی گہرائی مانگتے ہیں۔ اپنی پوری سچائی کے ساتھ۔ آیئے بارش کے پہلے پہلے قطروں میں شامل ہو جاتے ہیں...... آیئے

دادا جان اور اسی وقت آسمان سے پھوہار پڑنے لگی تھی۔

☆☆☆☆☆

شکنتلا

وسیم جبران

ایک دن شام کو ہوا خوری کے لیے جا رہا تھا کہ امی جان نے روک لیا۔ انھوں نے بتایا کہ شکنتلا آ رہی ہے اس کے لیے کمرہ تیار کرنا تھا۔ چناں چہ میں نے گیسٹ روم کا جائزہ لیا۔ جو اشیاء درکار تھیں ان کی فہرست بنائی اور جمیل میاں کو کمرے کی صفائی کا کام دے کر باہر نکل گیا تا کہ مطلوبہ چیزیں لا سکوں۔ جمیل گھر کا ملازم تھا۔ ہر فن مولا تھا۔ صفائی ستھرائی، لان کی دیکھ بھال اور گھر کے چھوٹے موٹے کاموں کے ساتھ ساتھ ڈرائیونگ بھی کر لیتا تھا۔ کچن کا کام اس کی بیوی جمیلہ نے سنبھال رکھا تھا۔ والد صاحب ملازمت کی غرض سے دبئی میں مقیم تھے۔ وہ ہر ماہ ایک معقول رقم بھیجتے تھے۔ جس سے گھر کے اخراجات بخوبی پورے ہوتے تھے۔ میں ان دنوں یونیورسٹی کے آخری سال میں تھا۔

اگلے دن شکنتلا آ گئی۔ دس سال بعد اسے دیکھ کر میں پہچان نہ سکا۔ کہاں وہ دس سال کی گول مٹول لڑکی اور کہاں بیس برس کی دبلی پتلی شکنتلا۔ دھانی رنگ کے سادہ سے شلوار قمیص میں وہ سادگی کا پیکر لگ رہی تھی۔ شکنتلا میری خالہ کی بیٹی تھی۔ اس کا گاؤں ہمارے شہر سے کافی دور تھا۔ قریباً پندرہ سو کلو

میٹر کا فاصلہ تھا۔ برسوں بعد آنا جانا ہوتا تھا۔ گزشتہ دس برس میں اتفاق سے جب بھی ان کے گاؤں جانا ہوا میں کسی نہ کسی وجہ سے نہ جا سکا۔ شکنتلا ہمارے شہر میں تعلیم کی غرض سے آئی تھی۔ اس کا داخلہ یونیورسٹی میں ہو گیا تھا۔ شکنتلا یہاں بہت خوش تھی۔

اس کے آنے سے گھر میں رونق سی ہو گئی تھی۔ وہ امی جان کے ساتھ ٹی وی ڈراموں کی باتیں کرتی، کچن میں جا کر جمیلہ سے نت نئی چیزیں بنواتی، لان کو سنوارنے کے لیے جمیل کو ہدایات دیتی۔ میرے ساتھ بھی شام کی چائے پر گپ شپ ہوتی۔ میں نے جب اسے دس سال کے بعد پہلی بار دیکھا تھا تو وہ مجھے اچھی لگی تھی مگر اب دھیرے دھیرے وہ میرے دل کی دھڑکن بنتی جا رہی تھی۔ اس کی یونیورسٹی ہمارے گھر سے قریب تھی اس لیے وہ پہلے آتی تھی میں جب گھر پہنچتا تو میری نگاہیں اسے ڈھونڈ رہی ہوتیں اور پھر جب وہ نظر آتی تو بے تاب دل کو قرار آ جاتا۔ اس کا دلکش چہرہ آنکھوں میں کھب جاتا تھا، پرکشش آنکھیں سپنوں سے بھری ہوئی محسوس ہوتیں اور شیریں آواز کانوں میں رس گھولتی تھی۔ اس کے باوجود میں نے کبھی اس سے کوئی ایسی بات نہیں کی تھی جو میرے دل کا راز افشا کر دیتی۔

اس کے دل کا حال مجھے معلوم نہیں تھا۔ میں اس سے پوچھنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ میرے دل میں ایک انجانا سا خوف تھا۔ اسی طرح دن گزرتے گئے۔ چند ماہ بعد میں نے محسوس کیا کہ وہ چپ چپ رہنے لگی ہے۔ بظاہر اس کی وجہ دکھائی نہ دیتی تھی۔ میں شاید زیادہ غور نہ کرتا لیکن ایک دن امی جان نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا۔ جب میں ان کے کمرے میں پہنچا تو خلاف معمول ٹی وی آف تھا اور وہ بیڈ پر بیٹھی کسی گہری سوچ میں گم تھیں حالاں کہ امی جان کے کمرے میں ٹی وی عموماً آن ہی رہتا تھا کیوں کہ ٹی وی دیکھنا ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔

”جی امی جان۔“ میں نے ان کے قریب صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ امی جان نے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد کہنا شروع کیا۔

”نبیل کیا تمھیں شکنتلا کے رویے میں کسی تبدیلی کا احساس ہوا ہے؟“

میں نے جو محسوس کیا تھا ان کے گوش گزار کر دیا۔ میری بات سن کر انھوں نے فکر مند لہجے میں کہا۔

”اگر ایسا ہے تو اس سے بات کرو اور پتہ لگانے کی کوشش کرو کہ کیا بات ہے۔ میں نے دو تین بار اس سے پوچھنے کی کوشش کی ہے مگر وہ ٹال جاتی ہے۔ آخر اسے کیا غم ہے۔ میں نے ہفتوں سے اسے مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا۔“

میں نے انھیں تسلی دی کہ میں شکنتلا سے بات کروں گا اور جو بات بھی ہوگی انھیں

آگاہ کروں گا۔ شام کا وقت تھا۔ شگفتلا اپنے کمرے میں تھی۔ میں نے سوچا کہ اسی وقت اس سے بات کرنی چاہیے چناں چہ میں اس کے کمرے کی طرف چلا گیا۔ نیم وا دروازے کے قریب جا کر میں نے ہلکی سی دستک دی۔

''جی'' شگفتلا کی آواز سنائی دی۔ اس نے ادھ کھلے دروازے سے میری جھلک دیکھ لی تھی۔ میں نے دروازہ کھولا اور اندر چلا گیا۔ وہ سامنے سٹڈی ٹیبل پر تھی۔ اس کے سامنے کتابیں موجود تھیں مگر وہ پڑھ نہیں رہی تھی۔ اتنے عرصے میں اس سے کچھ بے تکلفی ہو چکی تھی اس کے باوجود میں سوچ رہا تھا کہ بات کہاں سے شروع کروں۔

''ایسا لگتا ہے جیسے تم آج کل پڑھنے سے زیادہ سوچنے لگی ہو'' میں نے اس کے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''جی نہیں، آپ کو ایسا کیوں لگتا ہے'' اس نے فوراً کہا مگر وہ مجھ سے آنکھیں چرا رہی تھی۔

''گھر کی یاد آ رہی ہے؟''

''گھر تو یاد آتا ہی ہے''

''تو کیا تم یہاں خوش نہیں ہو؟''

''نہیں اب ایسی بھی بات نہیں''

''تمھاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

''میں بالکل ٹھیک ہوں''

''تو پھر چھوڑو کتابیں آؤ باہر چلتے ہیں میرا جی چاہ رہا ہے باہر جا کر کچھ کھایا جائے''

میں نے کہا۔ وہ چپ تھی جیسے فیصلہ نہ کر پا رہی ہو۔

''کئی دن ہو گئے ہیں ہم باہر نہیں گئے۔ چلو چلتے ہیں دل بہل جائے گا'' میں نے پھر کہا۔

''آپ کہتے ہیں تو ٹھیک ہے، چلتے ہیں'' اس نے مسکرا کر کہا مگر مجھے اس کی مسکراہٹ بناوٹی سی لگی۔ بہرحال وہ میرے ساتھ چل پڑی۔ میں نے کار سٹارٹ کی وہ میرے بائیں جانب فرنٹ سیٹ پر بیٹھی تھی۔ کچھ دیر بعد ہم شہر کے ایک عمدہ ریسٹورنٹ میں بیٹھے تھے۔ اس ریسٹورنٹ میں زیادہ رش نہیں ہوتا تھا۔ ہال میں مدھم روشنی تھی۔ ہلکی آواز میں موسیقی جاری تھی۔ باوردی ویٹر مستعد تھے۔ میں نے ایک کونے والی میز منتخب کی۔ ویٹر کو سوپ کا آرڈر دیا پھر شگفتلا کی طرف متوجہ ہوا۔

''شگفتلا میں بہت دنوں سے تم سے بات کرنا چاہتا تھا۔ کوئی ایسی بات ہے جو تمھیں پریشان کر رہی ہے، میں وہ بات جاننا چاہتا ہوں'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ وہ اپنے ہونٹ چبانے لگی پھر اس نے دھیرے سے کہا۔

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے'' شاید وہ بتانا نہیں چاہتی تھی۔ میں نے ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دیں۔ سوپ آ گیا۔ سوپ پیتے ہوئے بھی گفتگو جاری رہی۔ میں نے کھانے کا آرڈر دیا اور ایک بار پھر اصل

سوال پر آ گیا۔ اس نے دو تین بار انکار کیا مگر میں ہمدردی سے اصرار کرتا رہا کیوں کہ میں اس کی اداسی کی وجہ جاننا چاہتا تھا۔ اس کی آنکھیں نم ہو گئیں پھر وہ بولی۔
”میں کسی سے پیار کرتی ہوں“ اس کی بات سن کر میرے دل کو ایک دھکا سا لگا مگر میں نے خود کو نارمل رکھتے ہوئے کہا۔
”تو اس میں اتنا پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے“
”میرا ایسا بالکل بھی ارادہ نہیں تھا مگر محبت کسی ارادے سے کب ہوتی ہے۔ مجھے پتہ ہی نہیں چلا کہ کب وہ میرے دل میں اتر گیا اور اب میں اسے اپنے دل سے نہیں نکال سکتی۔ وہ میری رگ رگ میں سما گیا ہے“
شاید وہ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتی تھی اور میرے ہمدرد لہجے نے اس کے ضبط کو توڑ دیا تھا۔ اس کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔
ہم جب واپس آ رہے تھے تو دونوں خاموش تھے بس کار کے انجن کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ ثاقب اس کی یونیورسٹی میں ہی تھا مگر وہ آخری سال میں تھا۔ اتفاق سے ایک ملاقات ہوئی جس کے بعد تسلسل سے ان کی ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ میں اس سے زیادہ تفصیلات نہ پوچھ سکا تھا۔ مجھے خود بھی سنبھلنے کے لیے کچھ وقت درکار تھا۔
اگلے دن سہ پہر کو میں اپنے کمرے میں تھا جب وہ آ گئی۔ وہ مجھ سے بات کرنا چاہتی تھی۔ میں بھی پوری بات جاننا چاہتا تھا۔ وہ اس وقت بہت مضطرب لگ رہی تھی۔ میں نے اسے آرام سے بیٹھنے کے لیے کہا۔
”ثاقب کی بے اعتنائی مجھے مار ڈالے گی۔ نہ جانے میں نے ایسی کیا خطا کی ہے جو اس نے یہ روش اختیار کی ہے۔ آپ اندازہ بھی نہیں لگا سکتے کہ اس وقت میری کیا حالت ہے۔ میرا دل چاہتا ہے میں پھوٹ پھوٹ کر رو دوں“ اس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔
”اچھا مجھے کچھ تفصیل بتاؤ“ میں نے نرمی سے پوچھا۔
”سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا۔ ہم اکٹھے چائے پیتے تھے گپ شپ کرتے تھے۔ اپنے دل کا حال تو آپ کو بتا چکی ہوں محبت کا اقرار بھی ہوا اور وہ کہتا تھا کہ وہ بھی مجھ سے بہت محبت کرتا ہے۔ وہ میرا بہت خیال رکھتا تھا۔ میری ذرا سی پریشانی پر مجھ سے زیادہ پریشان ہو جاتا تھا۔ ہر وقت مجھ سے ملنے کے بہانے ڈھونڈتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ آخری سانس تک میرے ساتھ رہے گا۔ میں اس کی محبت سے سرشار تھی کہ پھر اچانک اس نے مجھ سے دوری اختیار کر لی۔ اب تو وہ مجھ سے بات بھی نہیں کرتا۔ میں نے کتنی بار کوشش کی کہ اس سے کچھ پوچھوں، اس سے اپنی تقصیروں کی معافی طلب کروں لیکن وہ تو میرے سائے سے بھی دور بھاگتا ہے۔ میں کئی بار اس کے سامنے گئی مگر اس نے آنکھ

بھر کر دیکھنا گوارا نہ کیا۔ اس وقت میری کیا حالت ہوتی تھی آپ سوچ بھی نہیں سکتے۔ جج بھی ملزم کو سزا سنانے سے پہلے اس کا جرم بتاتا ہے، اس نے تو یہ بھی گوارا نہ کیا۔ پتہ نہیں میں نے ایسا کیا جرم کیا ہے، مجھے اگر اپنی خطا معلوم ہو جائے تو میں اس کے پیروں پڑ کر معافی مانگنے کو تیار ہوں۔ کبھی کبھی مجھے ایسا لگتا ہے جیسے وہ مجھے اپنے قابل نہیں سمجھتا، شاید اسے مجھ سے زیادہ حسین لڑکی چاہیے تھی لیکن میں اپنے دل کو کیسے سمجھاؤں۔ اگر مجھ میں کوئی خامی ہے تو میں اسے ٹھیک کرنے کی بھرپور کوشش کروں گی۔ وہ مجھے بتائے تو سہی کہ کیا مسئلہ ہے؟“

اس کی باتیں سن کر میرے دل میں جیسے آگ بھڑک اٹھی۔ اس کا نازک جسم لرز رہا تھا اور دلکش چہرے پر حزن و ملال کی پرچھائیاں تھیں۔ اس کے باوجود وہ اتنی پیاری لگ رہی تھی کہ جی چاہتا تھا اسے بازوؤں میں بھر کر اتنا پیار کروں کہ وہ سارے دکھ بھول جائے۔ مجھے ثاقب پر غصہ آنے لگا اور دل میں اس کے لیے شدید نفرت پیدا ہوگئی۔ اگر اس نے شگفتہ کو ایسے ہی رلانا تھا تو اسے سبز باغ کیوں دکھایا تھا۔ سوچتے سوچتے مجھے شگفتہ پر بھی غصہ آنے لگا۔ ایک لڑکی کو اتنا تو خوددار ہونا چاہیے کہ اگر کوئی مرد اس سے بے اعتنائی کرتا ہے تو وہ بھی بے رخی اختیار کرے۔ اگر وہ اس کا خواہاں نہیں تو یہ اس کی متقاضی کیوں؟ میں نے شگفتہ کے گالوں پر بہتے ہوئے آنسوؤں کو اپنی انگلیوں کی پوروں سے پونچھتے ہوئے کہا۔

”بس اب مزید اشک مت بہاؤ۔ مجھے شبہ ہے اس نے کسی اور سے بھی دل لگا رکھا ہے۔ میں خود اس سے ملوں گا اور معلوم کرنے کی کوشش کروں گا کہ کیا معاملہ ہے۔“

میں شگفتہ کی یونیورسٹی میں گیا اور اس نے دور سے مجھے دکھا دیا کہ ثاقب کون ہے۔ اس کے بعد میں مختلف نوجوانوں سے ملا اور باتوں باتوں میں ثاقب کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ اس کے بعد ثاقب سے ملا اور اس سے راہ و رسم پیدا کر لی۔ شام کو میں اس کے گھر پہنچ گیا کہنے کو یہ اتفاق تھا مگر میں جان بوجھ کر گیا تھا تاکہ اس سے روابط بڑھائے جا سکیں۔ چند دن کی ملاقاتوں کے بعد سب کچھ معلوم ہو گیا۔

شام کو میں ذرا دیر سے گھر پہنچا تھا۔ شگفتہ میری منتظر تھی۔ میں نے اسے سمجھایا تھا کہ امی جان سے نارمل انداز میں باتیں کر لیا کرے وہ پریشان ہوتی ہیں۔ وہ اس وقت امی جان کے پاس ہی بیٹھی تھی۔ آنکھیں چار ہوئیں تو اس نے مجھے کھوجتی نگاہوں سے دیکھا۔ کھانے کا وقت تھا۔ کھانے کی میز پر میں جان بوجھ کر ہنسی مذاق کرتا رہا تاکہ ماحول خوشگوار رہے۔ کھانے کے بعد

امی جان اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ شکنتلا میری طرف بڑھی تو میں نے اسے کمرے کی طرف جانے کا اشارہ کیا۔ کمرے میں بیٹھ کر میں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ ثاقب کو بھول جائے۔ اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔

''آپ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں؟'' اس نے کمزور سی آواز میں پوچھا۔

''اس لیے کہ ثاقب نے تمھیں دھوکا دیا ہے۔ چند دن بعد اس کی شادی ہے'' میں نے بتایا۔ اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ اس کا سر جھک گیا تھا اور جسم کانپ رہا تھا۔

''اس کی منگیتر بہت امیر خاندان کی لڑکی ہے۔ اس کا باپ ملٹی نیشنل کمپنی کا مالک ہے۔ کروڑوں میں کھیلنے والے لوگ ہیں اور حقیقت تو یہ ہے کہ اس لڑکی نے ثاقب کو دیکھا تو وہ اسے بھا گیا۔ ثاقب اس موقع کو ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے فوراً تم سے ناتا توڑ کر اس کا ہو گیا'' میں نے تفصیل بتائی۔

شکنتلا نے اپنی آنسوؤں بھری آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور کہنے لگی۔

''مجھے یقین نہیں آ رہا۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ اس نے میرے ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھائی تھیں''

''اس کی قسمیں اس کی طرح ہی جھوٹی تھیں ۔ بہر حال میری معلومات درست ہیں۔ اسی لیے وہ تم سے بات نہیں کرنا چاہتا۔ اگر اس کی بھنک اس کی منگیتر کو پڑ گئی تو اس کا بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ میرا خیال تھا یہ سب کچھ سن کر وہ بھڑک اٹھے گی اور کہے گی کہ وہ ہر صورت اس سے ملے گی اور اس کو کسی اور سے شادی نہیں کرنے دے گی مگر شکنتلا کا ردِ عمل میرے توقعات سے بالکل مختلف تھا۔ اس چند گہری سانسیں لیں پھر بولی۔

''میری خدا سے یہی التجا ہے کہ وہ ہمیشہ خوش رہے۔ وہ میرا نہ ہو سکا تو کوئی بات نہیں میں تو اس کی ہوں۔ حساب برابر ہوا۔ مجھے اس کی محبت کے چند روز نصیب ہوئے یہ میری خوش بختی ہے۔ میں لازوال محبت کے ان دنوں کی یاد میں اپنی ساری عمر گزار سکتی ہوں۔ دورِ محبت کی یادیں میرے دل کو ہمیشہ تقویت دیتی رہیں گی'' بظاہر وہ اطمینان سے یہ سب کچھ کہہ رہی تھی لیکن اس کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ اسے کھل کر رونے کا موقع دوں شاید اس طرح اس کے دل کا غبار دھل جائے۔ چناں چہ میں نے اسے اس کے کمرے میں تنہا چھوڑ دیا۔

اس دن کے بعد شکنتلا مجھ سے ثاقب کے بارے میں بات نہیں کرتی تھی مگر اس کے بعد وہ مستقل اداس رہنے لگی۔ روز بروز وہ لاغر اور کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ یہ روگ اسے اندر ہی اندر کھا رہا ہے۔ میرا دل اس کی حالت دیکھ دیکھ کر کٹتا تھا۔ میں

مختلف طریقوں سے اس کی دلجوئی کی کوشش کرتا۔ اسے باہر کھانا کھلانے لے جاتا لیکن اس کی اداسی دور نہ کر سکا۔ جس دن ثاقب کی شادی تھی میں اسے لانگ ڈرائیو پر لے گیا۔ میں نے اسے نہیں بتایا تھا مگر نہ جانے اسے کیسے معلوم ہو گیا۔ وہ میرے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھی تھی۔ گاڑی میں میوزک لگا تھا۔ میں آس پاس کے دلکش نظاروں کی باتیں کر رہا تھا مگر وہ جواب نہیں دے رہی تھی۔ کبھی کبھار ہوں ہاں کر دیتی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ رو رہی تھی۔

''کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔ اس نے کہا ''آج ثاقب کی شادی ہے۔''

شاید اس نے کسی سہیلی سے پوچھا ہوگا۔ مجھے برا لگ رہا تھا۔

''شگفتہ تم خواہ مخواہ ایک بے وفا اور پست آدمی کے لیے رو رہی ہوں۔ وہ ہرگز اس قابل نہیں ہے کہ تم اس کے لیے ایک آنسو بھی بہاؤ'' میرا لہجہ تلخ ہو گیا۔

''آپ ایسا کہہ سکتے ہیں مگر میں نہیں کہہ سکتی۔ میں اسی طرح روتے روتے ایک دن مر جاؤں گی۔ مرنے والے کی خطائیں تو سب معاف کر دیتے ہیں۔ اگر آپ کو مجھ سے شکایت ہے تو مرنے کے بعد آپ مجھے معاف کر دیں گے اور شاید وہ بھی میری قبر پر آ کر دو آنسو بہا دے۔ زندگی میں نہ سہی مرنے کے بعد میری روح خوش ہو جائے گی'' اس کے بعد میں نے اس سے کچھ نہ کہا۔ مجھے اس پر غصہ آ رہا تھا۔ میں اسے سمجھانا چاہتا تھا مگر شاید اس وقت اسے سمجھانا بے کار تھا۔

ثاقب کی شادی کے بعد بھی شگفتہ کے رویے میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ یہ بھی حقیقت تھی کہ میرے دل میں اس کی محبت اسی طرح تازہ تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ میری نہیں ہے اس لیے اپنی محبت کو دل کے نہاں خانے میں چھپا رکھا تھا لیکن اب اس کی حالت دیکھ کر میں سوچنے لگا کہ اسے سمجھاؤں زندگی کے سفر میں کسی کے بچھڑ جانے سے سفر نہیں رکتا۔

ایک دن شام کو لان میں بیٹھے ہوئے میں نے بات چھیڑی۔ ''شگفتہ ایک بات تو بتاؤ۔ ثاقب نے تو شادی کر لی، تم کب شادی کرو گی؟''

اس نے شکایتی نظروں سے میری طرف دیکھا جیسے میں نے یہ سوال کر کے اسے تکلیف پہنچائی ہو پھر بولی۔

''پتہ نہیں، شاید میں عمر بھر تنہا رہوں۔''

میں نے سر ہلایا پھر خوشگوار لہجہ بناتے ہوئے کہا۔

''یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ کوئی تم سے شدید محبت کرنے لگے یا کرتا ہو تو کیا تم پھر بھی ایسا کرو گی۔''

''میں نے ایک ہی بار محبت کی ہے اور میرے جذبات میرے وجود کے ایک ایک ریشے میں جذب ہو چکے ہیں۔ انھیں دل

سے نکال دینا میرے لیے ممکن نہیں ہے اگر میں نے کسی طور ایسا کر بھی لیا تو میری ہستی بھی ریزہ ریزہ ہو جائے گی‘‘ شگفتہ نے مضبوط لہجے میں کہا۔

’’شگفتہ! اگر میں کہوں کہ میں بھی تم سے بے حد محبت کرتا ہوں تو کیا تم مجھے ٹھکرا دو گی؟‘‘ اس نے اپنا دلکش چہرہ میری طرف موڑا اور گویا ہوئی۔

’’کاش میں آپ کے لیے کچھ کر سکتی لیکن میں کیا کروں میرا دل غم سے بھرا ہے اس میں محبت کے لیے تو جگہ ہی نہیں ہے‘‘ میرا دل جیسے کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا۔ میں اسے کیسے بتاتا کہ میرے لیے اسے دل سے نکالنا بہت مشکل ہے۔

شام ہو گئی تھی۔ امی جان آوازیں دے رہی تھیں۔ ہم اندر کی طرف چل پڑے۔ وہ بہت عجیب لڑکی تھی۔ اس پر میری باتوں کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اس کی پڑھائی بھی شدید متاثر ہو چکی تھی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ وہ واپس اپنے گاؤں جانا چاہتی ہے۔ میں نے اسے منع کیا کہ چند دن رک کر سوچ اور سوچ سمجھ کر فیصلہ کرے۔ میں حیران تھا کہ وہ اپنی زندگی تباہ کرنے پر کیوں تلی ہے۔ میرا خیال تھا کہ دھیرے دھیرے میں اسے سمجھانے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔

ایک دن مجھے ثاقب سے متعلق ایک خبر ملی۔ میں نے سارے کام چھوڑے اور فوراً اس خبر کی تصدیق کے لیے چل پڑا۔ ساری معلومات حاصل کرنے کے بعد گھر پہنچا۔

’’شگفتہ! شگفتہ!‘‘ میں اسے ڈھونڈ رہا تھا۔

’’کیا بات ہے؟‘‘ وہ کچن سے نکلتے ہوئے بولی۔

’’چلو میرے ساتھ‘‘ میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور لان کی طرف چل پڑا۔ میری رفتار تیز تھی۔ شگفتہ کو جیسے بھاگنا پڑ رہا تھا۔

’’لگتا ہے آپ کوئی بہت ہی خاص بات بتانے والے ہیں‘‘ لان میں جا کر اس نے پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ کہا۔

’’آرام سے بیٹھ جاؤ۔ واقعی خاص خبر ہے؟‘‘

’’کیا ہے بتایئے ناں؟‘‘ اس نے کھڑے کھڑے کہا، اس کی آنکھوں سے اشتیاق جھلک رہا تھا۔

’’شگفتہ! ثاقب کی بیوی نے اسے چھوڑ دیا ہے۔ میں نے سب کچھ معلوم کر لیا ہے۔ ان دولت میں کھیلنے والوں کا مزاج ایسا ہی ہوتا ہے۔ اس لڑکی کا دل ثاقب پر آ گیا تو اس نے اپنے من پسند کھلونے کی طرح اس کی فرمائش کر ڈالی۔ ثاقب نے بھی کروڑوں کی دولت جھولی میں گرتے دیکھی تو فوراً ہاں کر دی۔ مگر اب شاید اس کی بیوی کا دل بھر گیا تھا۔ سنا ہے اس نے خلع کی درخواست دی تھی اور اس کے باپ نے پریشر ڈالا تھا۔ ثاقب شاید پریشر برداشت نہ کر سکا اس نے فوراً طلاق دے دی‘‘ میں نے تفصیل بتائی۔

میری توقع کے برعکس شگفتلا کے چہرے پر خوشی کا کوئی تاثر نہیں تھا۔ وہ پرخیال لہجے میں بولی۔
''بہرحال یہ اچھا نہیں ہوا۔ خیر ہم کیا کر سکتے ہیں۔ جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا ہے''
میرا خیال تھا کہ شگفتلا کے دل سے ثاقب کبھی نہیں نکل سکتا۔ چناں چہ میں دل پر پتھر رکھ کر ثاقب سے ملا اور اس سے کہا کہ ایک بار شگفتلا سے مل لو۔ ثاقب نے اسی شام ملنے کا عندیہ دیا۔ میں نے گھر آ کر شگفتلا کو بتایا۔ میرا خیال تھا وہ کھل اٹھے گی مگر اس کا چہرہ بے تاثر رہا۔
شام کو ثاقب گھر آیا۔ لان میں کرسیاں لگی تھیں۔ میں نے اسے وہیں بٹھایا اور شگفتلا کو بلایا۔ وہ ایک ایک قدم چلتی ہوئی لان میں آئی۔
''کیسی ہو؟'' ثاقب نے خوشگوار لہجے میں پوچھا۔
''میں ٹھیک ہوں'' شگفتلا نے مختصر جواب دیا۔
میں انھیں بات کرنے کا موقع دینا چاہتا تھا، چناں چہ میں نے کہا۔ ''میں چائے کا اہتمام کرتا ہوں'' لیکن شگفتلا نے مجھے روک دیا۔
''رکو'' میں نے چائے کے لیے کہہ دیا ہے۔
''شگفتلا میں تم سے بہت ضروری بات کرنے آیا ہوں'' ثاقب نے فوراً کہا۔
''تو کہو کیا کہنا چاہتے ہو، میں ہمہ تن گوش ہوں'' شگفتلا بولی۔
''میں نے تمھیں ٹھکرا کر غلطی کی تھی، شگفتلا میں تم سے شادی کے لیے تیار ہوں''
شگفتلا کا چہرہ تمتما اٹھا۔ اس نے پلکیں اٹھائیں اور مضبوط لہجے میں بولی۔ ''لیکن میں اس سے شادی کے لیے تیار نہیں ہوں۔ میں ایک دنیا پرست، حریص اور خود غرض شخص سے کیسے شادی کر سکتی ہوں۔ میرا تمھارے ساتھ نباہ نہ ہوگا''
مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا وہ پر اعتماد نظر آ رہی تھی۔ ثاقب کو جیسے کرنٹ سا لگا۔
''مگر تم تو مجھ سے محبت کرتی ہو''
''میں آپ کی صورت بھی دیکھنا نہیں چاہتی، میری آپ سے یہی گذارش ہے کہ آئندہ کبھی مجھے ملنے کی کوشش مت کیجیے گا۔ میں آج کے بعد آپ سے نہیں ملوں گی، اب براہ کرم تشریف لے جائیے'' شگفتلا نے مضبوط لہجے میں کہا۔
ثاقب کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ وہ مڑا اور تیزی سے باہر کے دروازے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ شگفتلا میری طرف مڑی اور بولی۔
''میرے لیے ٹکٹ کا بندوبست کر دیں مجھے گاؤں جانا ہے۔'' اس کے چہرے پر سرخی جھلک رہی تھی۔ میرے دل میں جیسے ایک چراغ روشن ہو گیا۔ مجھے اس کے گرد خود اعتمادی اور خودداری کا ہالہ نمودار ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ اب اس کے چہرے پر مایوسی اور حسرت کا نشان تک نہ تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔

☆☆☆☆☆

خوش فہمی

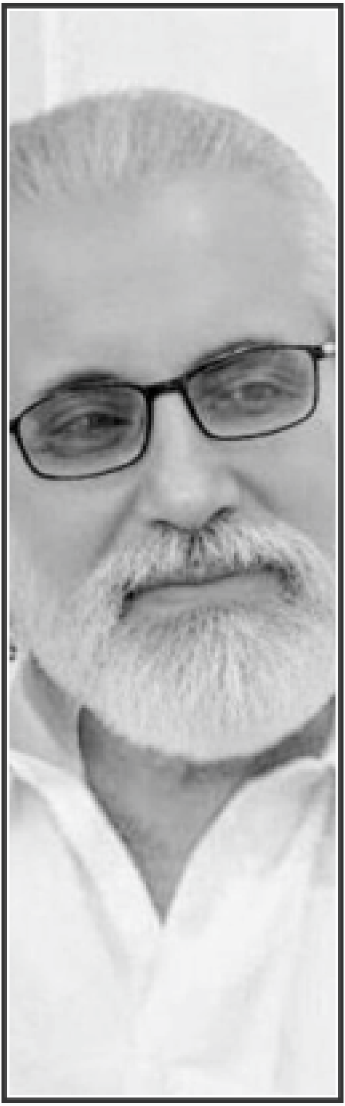

افضل ہزاروی

فلم کا آخری شو تاخیر سے چھوٹا۔ میں جب سینما سے باہر نکلا تو باہر ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ سب لوگ بارش سے بچتے بچاتے اپنی اپنی منزل کی طرف تیز تیز قدموں سے اور کچھ بھاگم بھاگ رواں دواں تھے۔ میں بھی بھیگتا ہوا اپنے بس سٹاپ تک پہنچا۔ مگر بس سٹاپ پر کوئی ویگن دکھائی نہ دی تو سوچا سامنے ایرانی ہوٹل میں چائے پی جائے۔ بیرے کو چائے کا آرڈر دیا چائے آنے پر مزے سے چسکیاں لینے لگا۔ تقریباً دس منٹ گزرے ہوں گے کہ اک ویگن آ کر بس سٹاپ پر رکی جس میں کوئی سواری نہیں تھی۔ ڈرائیور اور کنڈیکٹر بھی چائے پینے ہوٹل میں آ گئے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ ''استاد آگے جاؤ گے کہ نہیں؟''

ڈرائیور نے کہا کہ ''بالکل جائیں گے''

اس سے مجھے حوصلہ ملا۔ میں چائے ختم کر کے فوراً ویگن میں جا کر بیٹھ گیا۔ بارش قدرے تیز ہو گئی تھی۔

میں کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے بارش کا لطف لینے لگا کہ اچانک ایک حسین وجمیل، خوبرو لڑکی میری بغل والی سیٹ پر آ کر بیٹھ

گئی۔ میں اسے دیکھ کر حیران و پریشان ہو گیا۔ اس وقت تن تنہا ایک نوجوان دوشیزہ اور وہ بھی اکیلی اور پھر تمام خالی سیٹوں کو چھوڑ کر میری بغل میں ہی کیوں آ بیٹھی۔
میں نے اس سے کہا کہ ”بی بی لیڈیز سیٹ آگے ہے آپ وہاں جا کر بیٹھیں یہاں سب مرد حضرات بیٹھیں گے۔“ مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور خاموش رہی۔ میں نے ایک بار پھر کہا مگر نہ تو وہ اگلی نشستوں پر گئی نہ ہی کوئی جواب دیا۔
اتنے میں مزید پانچ چھ سواریاں آ گئیں مگر کسی نے بھی اس طرف دھیان نہیں دیا۔ سب اپنی اپنی سیٹوں پر براجمان ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد ڈرائیور اور کنڈیکٹر بھی آ گئے۔ انھوں نے بھی کوئی توجہ نہ دی۔ تو میں نے بھی چپ سادھ لی اور دل میں سوچا چھوڑو جب کسی کو پروا نہیں تو بیٹھا رہنے دو۔ میرے دل میں تو خوشی سے لڈو پھوٹ رہے تھے کہ ایک خوب صورت حسینہ میرے بغل میں بیٹھی ہے اور اس کے بدن کا لمس مجھے عجیب سرور دے رہا ہے۔
ویگن چل پڑی بارش ابھی تھمی نہیں تھی۔ کنڈیکٹر نے سب سے ٹکٹ لیے مگر اس لڑکی کی طرف کوئی متوجہ نہیں دی۔ راستے میں مسافر اپنی اپنی منزل پر اترتے گئے۔ سوائے میرے اور اس لڑکی کے ویگن میں اور کوئی مسافر نہیں رہا۔ میرا اسٹاپ آنے سے پہلے کنڈیکٹر نے مجھ سے پوچھا
”آپ کہاں اتریں گے؟“
میں نے بتایا ”آخری سٹاپ سے پہلے سٹاپ پر“
میرا سٹاپ آنے پر کنڈیکٹر نے مجھے مخاطب کیا
”بھائی صاحب آجائیں آپ کا سٹاپ آ گیا ہے“ میں اپنی سیٹ سے اٹھا اور لڑکی سے راستہ طلب کیا وہ خاموشی سے ایک طرف ہو گئی۔ میں نے گیٹ پر پہنچ کر کنڈیکٹر سے کہا ”میرا اسٹاپ تو آ گیا ہے مگر اس لڑکی سے بھی پوچھ لیں اسے کہاں اترنا ہے“
کنڈیکٹر نے چونک کر میری طرف دیکھا اور کہا ”کون سی لڑکی؟“
میں نے کہا ”وہی جو میری ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی ہے“
کنڈیکٹر نے حیرت سے کہا ”وہاں تو کوئی نہیں ہے آپ کس لڑکی کی بات کر رہے ہیں؟“
اس سے پہلے کہ میں چکرا کے گر جاتا مشکل سے ویگن سے نیچے اترا اور فوراً گھر کی طرف دوڑ لگائی اور پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔۔۔!!!

☆☆☆☆☆

معافی...... مگر کہاں سے

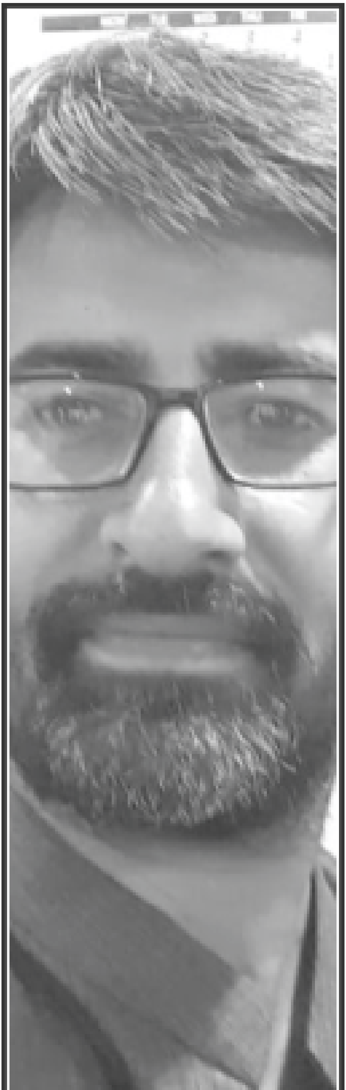

رانا محمد شاہد

کلاس روم میں داخل ہوتے ہی مس کلثوم نے دروازہ زور سے بند کر دیا۔ یہ سب خلافِ معمول تھا۔ چنانچہ بچے گھبرا گئے۔

”جس بچے نے کل کا ہوم ورک نہیں کیا، وہ کھڑا ہو جائے“۔ انھوں نے کرسی پر بیٹھتے ہی کہا۔ کلاس کے تمام بچوں نے جلدی جلدی اپنے بیگز سے کل کے ہوم ورک کی کاپیاں نکال کر میز پر رکھ لیں۔

جنید کو کھڑے دیکھ کر وہ اس کے پاس آگئیں اور غصے میں بولیں۔ ”تمہارا ہوم ورک کہاں ہے؟“

جنید سہم کر ادھر ادھر دیکھنے لگا، پھر ڈرتے ڈرتے بولا۔

”مس میں بھول گیا، مجھے معاف----“

اس سے پہلے کہ وہ جملہ مکمل کرتا۔ چٹاخ پٹاخ کی آوازیں آئیں اور مس کلثوم نے اپنا سارا غصہ اور دباؤ اس بچے پر نکال دیا۔ بچے کے گال سرخ ہو گئے۔ اس عمر کے بچے روتے ہیں مگر وہ بالکل نہیں رویا۔ سہما سہما پھر سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

”اگر تم نے آئندہ ہوم ورک نہیں کیا تو تمھاری چمڑی ادھیڑ دوں گی---“ مس کلثوم کا غصہ ٹھنڈا ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔

انھوں نے اسے کھڑا رہنے کے لیے کہا۔ جنید مسلسل ایک گھنٹہ کھڑا رہا۔ کلاس کے دوسرے بچے جنید کو دیکھ کر حیران ہو رہے تھے کہ اگر وہ اس کی جگہ ہوتے تو شاید رو دیتے۔

اگلے دن جنید سکول نہیں آیا۔ دوپہر کو سکول کی دو ٹیچرز مس کلثوم کے کمرے میں آئیں اور انھیں کہا کہ کل آپ نے جس بچے کو بے دردی سے مارا تھا۔ گھر جا کر وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ اس کے گھر والے بہت پریشان تھے۔ انھوں نے یہ بات ہم سے شیئر بھی کی۔ آپ کو اپنی اس غلطی پر پرنسپل صاحبہ کے آفس جا کر معافی مانگنا ہوگی۔ کیونکہ پرنسپل صاحبہ کا کہنا ہے کہ ہم اپنے سکول میں کسی ٹیچر کو یہ اجازت نہیں دے سکتے کہ وہ بچوں کو یوں بری طرح سے مارے۔ آپ کے کچھ ذاتی مسائل تھے تو آپ چھٹی کر لیتیں"۔

مس کلثوم نے ان کی مسلسل باتیں تحمل سے سنیں اور کچھ توقف کے بعد دوٹوک انداز میں کہا۔

"میں نے اپنی کلاس کے طالب علم کو مارا ہے۔ اگر وہ کام نہیں کرے گا تو اور ماروں گی۔ پرنسپل صاحبہ سے کہہ دیجیے گا کہ میں ان سے معافی نہیں مانگوں گی" دونوں ٹیچرز مس کلثوم کے اس رویے پر حیران تھیں مگر وہ خاموشی سے چلی گئیں۔

تھوڑی دیر بعد پرنسپل کے آفس سے کسی شخص نے آ کر کہا۔ "مس کلثوم آپ کو میڈم نبیلہ بلا رہی ہیں"۔ تھوڑی دیر بعد وہ پرنسپل کے روبرو کھڑی تھیں۔

"جی تو آپ معافی نہیں مانگیں گی"۔ پرنسپل نبیلہ نے مس کلثوم کی چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"بالکل بھی نہیں--- میں نے بچے کو کام نہ کرنے پر ذرا زیادہ سزا دے دی ہے۔ میرے پاس یا کسی بھی ٹیچر کے پاس سزا کا کوئی پیمانہ نہیں ہوتا۔ بعض اوقات ٹیچر طالب علم کو زیادہ سزا دے دیتا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ معافیاں مانگتا پھرے---" مس کلثوم اپنے موقف پر قائم تھیں۔ کچھ لمحے خاموشی میں گزرے اور پھر مس کلثوم دوٹوک انداز میں بولیں۔

"آپ مجھے سکول سے نکال دیں یا نکلوا دیں۔ مجھے منظور ہوگا۔ دوسرا کوئی آپشن نہیں ہے"۔ پرنسپل مس کلثوم کی باتوں پر مسکراتی رہیں۔ سکول پرنسپل نبیلہ اور دوسری ٹیچرز مس کلثوم کی نفسیات کو جانتی تھیں۔ وہ یہ بھی جانتی تھیں کہ کبھی معافی نہیں مانگے گی۔ انھیں مس کلثوم سے کچھ ذاتی عناد تھیں۔ جس کی وجہ سے وہ ان سے معافی منگوا کر

اپنے کسی جذبے کی تسکین چاہتی تھیں۔ مگر باوجود کوشش کے پرنسپل اور دیگر ٹیچرز اپنے اس جذبے کی تکمیل نہ کر پائیں۔

تیسرے دن بھی جب جنید سکول نہ آیا تو مس کلثوم کو فکر لاحق ہوئی۔

”بلال جنید تمہارے محلے میں رہتا ہے۔ آج تیسرا دن ہے۔ خیریت تو ہے وہ نہیں آ رہا“۔ انھوں نے کلاس کے مانیٹر بلال سے دریافت کیا۔ مس کلثوم دل کی اتنی بری نہ تھیں۔ اس دن وہ بہت پریشان تھیں اور یہی پریشانی جنید پر نکال دی۔

”مس وہ بات دراصل یہ ہے کہ جنید کے والد نہیں ہیں۔ وہ ایک یتیم بچہ ہے۔ اس کی امی ڈر گئی ہیں اور اب وہ اسے سکول بھیجنا نہیں چاہتیں“۔

”اوہو یہ تو واقعی مجھ سے بڑی غلطی ہوئی“۔ مس کلثوم نے خود کلامی کے انداز میں آہستہ سے کہا۔

”بچو آپ انگلش اور میتھ کا کام کریں اور بلال تم ذرا میرے ساتھ آؤ“۔

”اچھا ہم جنید کے گھر جائیں گے ابھی۔ سکول کے باہر سے رکشے میں بیٹھیں گے اور ایک گھنٹے سے پہلے واپس آ جائیں گے“۔ مس کلثوم نے برآمدے میں چلتے ہوئے بلال سے کہا۔

بیس منٹ کے بعد وہ جنید کے گھر اس کے سامنے بیٹھی تھیں۔ اب اس کی طبیعت بہتر تھی ۔ تاہم گال پر سرخ نشان ابھی بھی نمایاں تھا۔

”آپ میری بھی ماں جیسی ہیں۔ میں جنید کے ساتھ اپنے سخت رویے کی معافی مانگتی ہوں“۔ انھوں نے جنید کی والدہ سے کہا اور پھر کرسی سے اٹھیں۔ اپنے سامنے کھڑے جنید کے سامنے دوزانو ہو کر بیٹھ گئیں۔ اس کے گال سہلائے اور نم آلود آنکھوں سے کہا۔

”بیٹا مجھے معاف کر دینا۔ تمھیں بلاوجہ اور بہت زیادہ مارا“۔ پھر اسے اپنے قریب کیا۔ اس کے اسی سرخ گال پر ہلکی سی پیاری کی اور آہستہ سے کان میں کہا۔ ”آپ نے کل سے سکول لازمی آنا ہے“۔

”جی مس میں ضرور آوں گا“۔ بچہ اپنی ٹیچر کا یہ رویہ دیکھ کر چہک اٹھا۔ اس کے چہرے کی خوشی دیدنی تھی۔ مس کلثوم نے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی سے اپنی آنکھوں میں آئے آنسو صاف کیے اور جلدی سے باہر آ گئیں۔ جنید کے گھر سے نکلتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی کہ اسے جہاں معافی مانگنی تھی، وہاں سے وہ سرخرو ہو چکی تھیں۔

☆☆☆☆☆

”روح کی خودکشی“

دھوپ کی ایک پتلی سی کرن کمرے کی کھڑکی سے اندر داخل ہو کر فرش پر اس طرح بکھری تھی، جیسے کسی مردہ خواب کی لاش پر روشنی کی آخری آیت اتری ہو۔ دیوار پر لگا سفید گھڑیال مسلسل وقت کی لاش کا پوسٹ مارٹم کر رہا تھا، اور وہ، ایلیا، بستر پر لیٹی آنکھیں بند کیے اندر کے سناٹے کو سن رہی تھی۔

ہوا میں ہلکی سی دوا کی بُو تھی، جیسے سانسوں پر کوئی نیم بے ہوش دعا لکھی ہو۔ باہر سے گزرتی ایمبولینس کی آواز کمرے کی خاموشی کو کاٹ کر گزر جاتی، بالکل ایسے جیسے کوئی یاد اچانک دل پر چاقو پھیر دے۔

ایلیا کو اپنے جسم سے کوئی گلہ نہیں تھا۔ وہ مکمل تھا، متناسب، قبول شدہ۔ مگر اس کے اندر--- ایک اندھی غار تھی، جہاں روح قید تھی، زخمی، سسکتی، اور بے صدا۔

کبھی کبھی اسے لگتا کہ وہ ایک چلتی پھرتی قبر ہے۔

جسم ایک مجسمہ ہے، اور اس کے اندر جو کچھ بچا ہے وہ فقط راکھ۔

”میں خالی ہوں-----“

یہ جملہ وہ اکثر آئینے سے کہتی، جیسے وہ کوئی سچائی ثبت کر رہی ہو، کسی عدالت میں دیا گیا بیان۔ مگر آئینہ ہمیشہ خاموش رہتا ہے۔ وہ صرف عکس لوٹاتا ہے، احساس نہیں۔

ایلیا اس نسل کی نمائندہ تھی جس نے خودی کو انسٹاگرام کے فلٹر میں گم کر دیا، اور محبت کو ڈیلیٹ میسج میں دفن کر دیا۔ ہر دن ایک نئی پوسٹ، ہر رات ایک نئی تنہائی۔ چیخیں تھیں، مگر ڈیجیٹل، آنکھیں تھیں، مگر جذبات آف لائن۔

پھر وہ دن آیا۔

خاموش سا، بالکل عام سا۔ مگر اندر ایک ہنگامہ خیز اعلان لیے ہوئے۔

ایلیا نے آنکھ کھولی، اور پہلی بار شدت سے محسوس کیا کہ اب اور کچھ باقی نہیں، نہ خواب، نہ یقین، نہ خدا۔

نہ ہی وہ روح، جو کبھی اس کی تھی۔

اس نے طے کیا کہ وہ آج مر جائے گی۔

نہیں، جسم نہیں ---- وہ تو ویسے ہی ایک پنجرہ ہے۔

شاہ روم خان ولی

مرنا تو روح کو ہے۔
اس نے اپنی روح کی خودکشی کا فیصلہ کیا۔
اس فیصلے کا کوئی منظر نہیں تھا۔ نہ چھت سے چھلانگ، نہ زہر کی پڑیا۔
بس ایک گہری خاموشی، ایک حتمی لاتعلقی۔
جیسے وہ اپنی روح سے بچھڑ کر اسے تنہا چھوڑ دے گی--- اندھیرے میں، چیختی ہوئی، بے نام۔
مگر قدرت شاید اپنی کہانیوں کو یکدم ختم نہیں کرتی۔
اس دن، کسی ساعتِ نایاب کی طرح، ایک اجنبی کمرے میں داخل ہوا۔
اس کے ہاتھ میں کوئی دوا نہ تھی، نہ آنکھوں میں کوئی ترس۔
بس ایک سوال تھا----
"تم نے کبھی اپنی روح کو خط لکھا ہے؟"
ایلیا نے چونک کر اسے دیکھا۔
"روح؟ وہ تو مر چکی ہے---"
"نہیں۔"
وہ ہلکا سا مسکرایا، "وہ بس تم سے ناراض ہے۔ روحیں مرا نہیں کرتیں، وہ چھپ جاتی ہیں، جب ہم انہیں سننا چھوڑ دیں۔"
یہ جملے لفظ نہیں تھے--- جیسے لمس تھے، اندر کہیں گونجتے ہوئے۔
ایلیا کا دل پہلی بار دھڑکا۔
نرمی سے، ہلکے سے، جیسے کسی پاتال میں کوئی بجھی ہوئی روشنی پھر سے جھلملا اٹھی ہو۔
اس رات ایلیا نے موبائل نہیں چھوا۔
اس نے نہ فلٹر چہرہ لگایا، نہ جعلی پوسٹ لکھی۔
اس نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر خود سے کہا---!!!!
"میں ہوں--- اور میں سن رہی ہوں۔"
پہلی بار، برسوں بعد، اس کی آنکھ سے آنسو نکلا--- ایک واحد قطرہ، جو روح کی قبر پر ڈالا گیا پہلا پانی تھا۔
اگلی صبح کمرہ خالی تھا۔
نرس نے سمجھا وہ کہیں چہل قدمی کو گئی ہوگی۔
مگر تکیے پر ایک پرچہ پڑا تھا!!
"میں نے اپنی روح کی خودکشی روک دی ہے۔
اب میں اسے جینے دوں گی، سنے بغیر نہیں۔
میں نے اس کی اذیت کو پہلی بار محسوس کیا ہے۔
اب میں جینے کی اذیت کو قبول کر رہی ہوں---
کیوں کہ سچ یہی ہے کہ
مر جانا آسان ہے،
مگر خود کو سننا
سب سے مشکل عبادت ہے۔"
ایلیا نے خودکشی نہیں کی----
اس کی روح نے کی تھی۔
اور جب روحوں کو سنا جائے--
تو وہ دوبارہ جینا سیکھ لیتی ہیں۔

☆☆☆☆☆

”کیا عزت صرف سوال ہے؟“

رانیہ

”چائے بنالی؟“

”جی، بنالی۔ آپ کے کمرے میں لے آؤں؟“

”تو اور کہاں لاؤ گی؟ کسی مہمان خانے میں؟“

نرگس کے ہونٹ ہلے، مگر لفظ گلے میں اٹک گئے۔

”سن رہی ہو؟“ وہ مزید تلخی سے بولا، ”میری باتوں کا جواب کیوں نہیں دیتی؟“

”جواب دیا تو ناراض ہو جائیں گے، خاموشی اختیار کروں تو گستاخ؟“

شوہر صوفے پر پیر پھیلا کر بیٹھ گیا، ٹی وی کی آواز اونچی کر دی۔

”باہر کی عورتیں شوہروں کے پاؤں دباتی ہیں، اور تم...... تمہیں بس باتیں اور بدتمیزی سوجھتی ہے۔“

نرگس نے نظر جھکا لی، دل کے اندر کچھ چرمرایا۔

”آپ کی خدمت کرتی تو ہوں۔ مجھے تو خود کے لیے بھی وقت میسر نہیں، پھر بھی آپ کبھی خوش نہ ہو سکے۔

اور میں تو صرف عزت چاہتی ہوں۔ محبت نہ سہی، عزت تو دی جا سکتی ہے؟“

تم زبان دراز ہو نرگس، اپنی زبان کو کنٹرول میں رکھا کرو، کوئی ضرورت نہیں استعمال کرنے کی۔

اس کے لب آدھے کھلے اور پھر بھینچ کر رہ گئے۔

”امی جی، آپ سے کچھ عرض کرنی تھی......“

ساس نے موبائل سے نظریں ہٹائے بغیر کہا، ”اب کیا نیا مسئلہ ہے؟“

”نہیں، صرف یہ کہ چھ ماہ ہو گئے امی سے نہیں ملی، میں ایک دن کے لیے گھر رہنے جا سکتی ہوں؟

”یہ گھر دفتر نہیں، جہاں اجازت لی اور چل پڑے۔ بہو بن کر رہنا ہے تو اسی گھر کو اپنا گھر سمجھو۔“

”پر امی جی......“

”بس! وہی ضد؟ تمہیں سمجھ نہیں آتی؟ میرا بیٹا ناراض ہو جاتا ہے تمہاری ان حرکتوں سے۔“

نرگس نم آنکھوں سے پلٹ گئی۔ ”یا اللہ میری کوششوں پر رحمت فرما۔“ وہ ہاتھ اٹھائے دعا گو تھی۔

دعا شاید قبول ہو چکی تھی۔

دن ایسے ہی گزرتے۔ نرگس ہر کام مکمل کرتی

—صفائی، کھانا، کپڑے، سسرال کے رشتے داروں کی آؤ بھگت، اور شوہر کی خوشنودی کی کوشش۔ مگر ہر دن ایک جیسا، بے رنگ۔

رات گئے چپ چاپ بیٹھ کر لیپ ٹاپ آن کرتی۔ سب سو جاتے تو وہ اپنی ڈھکی چھپی صلاحیتوں کو سامنے لاتی۔ اُس نے پرانے کانٹیکٹ نکالے، کالج یونیورسٹی فیلوز سے مدد لی۔ کچھ سیکھتی، کچھ لکھتی، کچھ کماتی۔ ہر صبح وہی چائے، وہی نرمی، وہی خاموش برداشت۔

"تم میری اجازت کے بغیر کام نہیں کرسکتی ہو۔"

"میں نے کبھی آپ کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کیا، بس اپنے حصے کا اعتماد واپس لینا چاہتی ہوں۔"

"تم عورت ہو نرگس، عورت مرد کا مقابلہ نہیں کرسکتی ہے!"

"جی، مگر کیا وہ انسان نہیں ہوتی؟"

"تمھاری بک بک بند نہیں ہوگی۔" ریحان کروٹ بدل گیا۔

10$ کی آمدنی ہوئی، بس پہلی بار جب اس نے شوہر کو نہیں بتایا، نہ کسی اور کو۔ اس نے اپنا کام جاری رکھا—

ایک گھنٹہ، دو گھنٹے، روز۔ گھر کے کام بھی کرتی، آن لائن بھی۔

ریحان کمرے میں داخل ہوا۔

نرگس کی میز پر ایک بڑا لفافہ رکھا تھا۔

"یہ کیا ہے؟"

"میری پہلی کتاب شائع ہوئی ہے۔"

"کیا؟ تم نے لکھا؟ کس نے اجازت دی؟"

"میں نے عزت مانگی تھی، اجازت نہیں۔"

ماں جی نے ایک دن طنزیہ انداز میں پوچھا،

"اب کیا عزت کا تاج سر پر رکھوگی؟"

نرگس مسکرا کر بولی،

"نہیں اماں جی، تاج نہیں، ایک چھوٹا سا وقار چاہیے تھا، جو کبھی کسی نے دیا نہیں۔ اب میں خود کو خود جانتی ہوں، خود سنبھالتی ہوں، اور ہاں... خود سے محبت بھی سیکھ لی ہے۔"

"رشتہ تبھی معنی رہتا ہے جب اس کے ساتھ عزت بھی ہو۔ بغیر عزت کے کوئی بھی رشتہ صرف ایک بوجھ بن جاتا ہے۔"

صبح کے وقت نرگس نے چولہا جلایا تو گیس کی ہلکی سی سرگوشی اس کے دل کے اندر کی خالی جگہوں میں سنائی دی۔ اُس نے دودھ چڑھایا، ناشتہ بنایا، اور تین کپ چائے۔ سب اپنے اپنے کمرے سے نکل کر ٹی وی کے سامنے آ بیٹھے۔

(ساس) ابرو چڑھا کر:

"ٹوسٹ تھوڑے نرم ہوتے تو کیا حرج تھا؟

دو منٹ پہلے نکال لیتی۔"

نرگس نے سر جھکا کر جواب دیے بغیر دوسرا پیالہ ساس کے آگے رکھ دیا۔

(شوہر) اخبار سے نظریں ہٹائے بغیر:

"نرگس، ناشتے میں آج بھی وہی چیزیں؟ کبھی کچھ نیا نہیں؟"

وہ چپ رہی۔ روز کے یہ الفاظ اب نئی بات نہیں تھے۔ بس وہ دل ہی دل میں سوچتی تھی:

"کیا کبھی میری خاموشی کسی کو سنائی دے گی؟"

نرگس نے ماسٹرز کیا تھا، مگر سسرال میں یہ بات کمزوری بنا دی گئی۔

(شوہر) اک دن طنزیہ لہجے میں:

"کتنی ڈگریاں تھیں تمہارے پاس؟ کوئی فائدہ تو نہیں گھر میں! عورت کو اپنے شوہر کی رضا میں جینا چاہیے، باقی سب تو دکھاوے کی چیزیں ہیں۔"

(نرگس) آہستہ اور ادب سے:

"کیا عورت کی رائے اور مرضی کچھ نہیں ہوتی؟"

(شوہر) چڑ کر:

"زیادہ سوال نہ کیا کرو، تمہارا کام گھر سنبھالنا ہے، دلیلیں دینا نہیں!"

چند مہینوں میں اُس نے اپنا اک چھوٹا سا آن لائن پلیٹ فارم بنا لیا۔ عورتوں کے لیے رہنمائی، چھوٹے کورسز، اور تحریری مدد۔

نرگس اب تنہا نہیں تھی۔ وہ ہر کام وہی کرتی تھی، مگر اب خود کو بھولتی نہیں تھی۔

ریحان کو گمان گزرا:

"کیا تم آج کل کسی سے بات کرتی ہو؟ فون میں کافی مصروف رہتی ہو۔"

(نرگس) پُرسکون لہجے میں:

"نہیں۔ بس خود سے بات کرنا سیکھ لیا ہے۔"

(شوہر) تلخی سے:

"عورت کو اتنا فارغ نہیں ہونا چاہیے کہ وہ فضول کاموں میں لگ جائے۔ مجھے تم پر اعتبار نہیں۔"

نرگس نے فقط مسکرا کر نظریں جھکا لیں۔

(نرگس) دل میں:

"کاش تم جانتے کہ میں اب اپنی ضروریات کے لیے کسی پر بوجھ نہیں اور تمہارا اعتبار تھا ہی کب مجھ پر؟"

ساس اور شوہر کی بے رخی باقی تھی، مگر وہ اب دل سے زخمی نہ ہوتی تھی۔

نرگس (اپنے آپ سے):

"جب عورت خود کو سنبھالنا سیکھ جائے، تب اُسے کسی اور کی تائید یا تذلیل کی پروا نہیں رہتی۔"

چھوٹے چھوٹے کام، آن لائن تحریریں، فری لانسنگ۔ اب وہ شوہر سے عیدی نہیں مانگتی، ماں جی کے طعنے پر آنکھ نم نہیں کرتی۔

سردیوں کی وہ شام کچھ بدلی بدلی سی تھی۔ باہر کہر چھایا ہوا تھا، مگر نرگس کی دنیا میں عجیب سی روشنی اتر رہی تھی۔

دروازہ زور سے کھلا۔

ریحان کی آواز کسی طوفان کی مانند گونجی:

"امی! فیکٹری میں آگ لگ گئی ہے۔ سب کچھ جل گیا۔"

سنک میں خاموشی سے ہاتھ دھوئے اور اندر جا کر اپنی پرانی فائل نکالی۔ اسے نہ کسی کو کچھ جتانا تھا، نہ کچھ کہنا تھا۔ بس بینک چیک لکھا۔

ساس کے رونے کی آوازیں بہت بلند تھیں۔

ریحان کے سامنے آ کر چیک رکھا۔

"یہ کیا ہے؟"

"فیکٹری کی دوبارہ بنیاد رکھنے کے لیے آپ کے کام آئے گا۔ آن لائن کام سے --- جمع کیا تھا اور میں آج امی کے ہاں جانے والی ہوں کچھ دنوں کے لیے۔"

ریحان نے خاموشی سے چیک تھاما۔ اسے یاد آیا کیسے وہ ہر رات اسے طعنے دیتا:

"بس عورت ہو عورت ہی رہو، زیادہ ہوا میں نہ اُڑو۔"

نند کی آواز بھی گونجی:

"کیا کرتی ہے ہر وقت موبائل پہ؟ شاید کسی سے باتیں کرتی ہوگی۔"

ساس کی نظر میں تو وہ ہمیشہ ہی "بس گزارے لائق" بہو تھی۔

مگر آج... جب سب بے بس تھے... تو وہی نرگس، جو کبھی بولتی نہیں تھی، سب کے کام آ گئی۔

ریحان نے نظریں جھکائیں، اور پہلی بار نرگس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا: "ٹھیک ہے تمھیں چھوڑ آتا ہوں۔" ریحان کی دھیمی آواز نرگس کے کانوں میں پڑی تب وہ جانے کو پلٹی۔

"میں شرمندہ ہوں نرگس...... میں نے کبھی تمھاری قدر نہ کی۔"

نرگس پلٹی نہیں، بس مسکرائی۔ وہ وہی نرگس تھی جو صبح سے شام، شام سے رات کام کرتی تھی۔ مگر اب... اب وہ خودکفیل تھی۔

اب اسے کسی کی منظوری نہیں چاہیے تھی۔

اور سب سے بڑھ کر......

اسے اب خود سے محبت ہوگئی تھی۔

خاموش رہنے والی نرگس...... اب اپنی زندگی کی آواز بن چکی تھی!"

☆☆☆☆☆

خالی مکانوں کے مکین

فاروق نے دروازہ کھولا تو شبانہ کے چہرے پر ایک لمحے کو سکون کا ہلکا سا عکس ابھرا، جیسے وہ اس انتظار میں بیٹھی ہو کہ وہ لوٹے، لیکن اگلے ہی لمحے وہ چہرہ پھر سے ویسا ہی سپاٹ اور اجنبی ہو گیا جیسا کئی مہینوں سے تھا۔

فاروق نے جوتے اتارے، بیگ میز پر رکھا، اور بنا کچھ کہے سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا۔

شبانہ نے کچن میں جا کر چائے کا پانی چولہے پر رکھا، اور کھڑکی سے باہر سست شام کی دھندلی روشنی کو دیکھتی رہی۔ زندگی جیسے ہر لمحہ پس منظر میں جا چکی تھی۔ روز کی یہی ترتیب تھی، ایک جیسی خاموش شامیں، ایک جیسے منتشر دن، اور درمیان میں ایک ایسا خلا، جو لفظوں، آنکھوں یا لمس سے پُر نہ ہو سکا۔

ایک زمانہ تھا جب ان کے درمیان الفاظ کی بھیڑ ہوتی تھی۔ صبح کی چائے پر باتیں، شام کے کھانے پر ہنسی، اور رات کو خوابوں کی سانجھ۔ شبانہ کا ہنسی سے لبریز جملہ آج بھی فاروق کے ذہن میں کبھی کبھی دستک دیتا تھا:

”تم خاموش ہوتے ہو تو مجھے لگتا ہے جیسے ہم دو الگ دنیاؤں کے باشندے ہو گئے ہوں......“

مگر اب وہ دن بیت چکے تھے۔ اب وہ دونوں ایک ہی دنیا میں رہتے ہوئے بھی اجنبی تھے۔

فاروق بینک میں اسسٹنٹ منیجر تھا۔ ہر دن کی مشینی مصروفیات، فائلوں، میٹنگز اور رپورٹوں میں الجھ کر وہ اکثر خود کو زندہ لاش سا محسوس کرتا تھا۔ شبانہ نے تعلیم یافتہ اور سلجھی ہوئی عورت کی طرح اس گھر کو، اس رشتے کو سنبھالا تھا، لیکن فاروق کی

مسعود تنہا

سرد مہری کے سامنے رفتہ رفتہ اس کا جوش ماند پڑنے لگا۔

ان کے دو بچے تھے، علی اور فاریہ۔ علی اب کالج میں تھا، اور فاریہ سکول کے آخری سال میں۔ وہ دونوں بھی اس خاموشی کے ماحول سے گھبرا گئے تھے۔ علی اکثر دوستوں کے گھر دیر تک رک جاتا، اور فاریہ نے اپنے آپ کو کتابوں میں گم کر لیا تھا۔ اُن کا گھر اب ایک ایسا مکان بن چکا تھا، جس میں افراد تو بستے تھے، لیکن کوئی مکالمہ، کوئی دھڑکن، کوئی زندگی نہیں تھی۔ صرف سانسیں تھیں، جو چلتی تھیں، اور در و دیوار، جو سنتے نہ تھے۔

ایک دن شبانہ نے امی کے گھر جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ فاروق نے رسمی لہجے میں پوچھا،

"کب جاؤ گی؟" "کل۔ دو ہفتے رہوں گی۔"

"ٹھیک ہے۔"

بس یہی تین جملے، جیسے دو سرکاری اہلکار کسی کاغذ پر دستخط کے لیے گفتگو کر رہے ہوں۔

شبانہ نے سوچا، شاید فاروق اسے روکے گا، شاید ایک سوال کرے گا، مگر ایسا کچھ نہ ہوا۔

جب وہ اگلے روز سامان کے ساتھ دروازے پر کھڑی تھی، تو فاروق نے محض اتنا کہا:

"اپنا خیال رکھنا۔" اور شبانہ نے اس جملے میں بھی ایک رسمی مہربانی محسوس کی، محبت نہیں۔

شبانہ جب اپنے والدین کے گھر پہنچی تو کچھ لمحوں کے لیے زندگی دوبارہ رواں ہوئی۔ اماں نے سر پر ہاتھ پھیرا، اور ابا نے حسبِ معمول اخبارات کے ساتھ سیاسی گفتگو چھیڑ دی۔ چھوٹا بھائی، سعد، جو اب خود بھی شادی شدہ تھا، بہن کو دیکھ کر خوش ہوا، مگر آنکھوں میں تشویش تھی۔ ایک رات جب سب سو گئے، سعد کمرے میں آیا اور بولا،

"آپ خوش نہیں ہو... نظر آ رہا ہے۔

"شبانہ نے آنکھیں چرا لیں۔

"سب خیریت ہے۔ بس تھکن ہے۔"

سعد مسکرا دیا، مگر اُس کی مسکراہٹ میں خلوص کے ساتھ درد بھی شامل تھا۔

"کسی دن دل کا بوجھ بھی ہلکا کر لیا کریں۔ ہم بہن بھائی صرف رسموں کے لیے نہیں ہوتے۔"

شبانہ کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ وہ بولی نہیں، مگر دل کی ایک پرت جیسے کھل گئی۔ اُسے اپنے اندر کچھ ہلتا محسوس ہوا۔ برسوں کی دبی ہوئی خواہشیں، باتیں، لمس، قربت... سب ایک لمحے میں ایک تصویر بن کر آنکھوں کے

سامنے آ گئے۔

فاروق اُدھر گھر میں بالکل تنہا تھا۔ بچوں سے بھی کترانے لگا تھا۔ سناٹا اب محض دیواروں میں نہیں، اُس کے اندر بھی گھر کر چکا تھا۔

جب چائے بنانی پڑی، تو اُسے شبانہ کے ہاتھوں کی گرمی یاد آئی۔ جب الماری سے کپڑے نکالے، تو وہ ترتیب یاد آئی جو وہ دیتی تھی۔ ایک رات علی کمرے میں آیا، اور بولا: ''ابو... امی سے بات ہوئی؟''

فاروق نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''کبھی لگتا ہے، ہم سب مل کے بھی اکیلے ہو گئے ہیں۔''

یہ کہہ کر علی باہر نکل گیا، اور فاروق اپنی جگہ جیسے جم کر رہ گیا۔ اُسے لگا، اس کے بیٹے نے وہ بات کہہ دی ہے جو اس نے برسوں سے اپنے آپ سے بھی نہیں کہی تھی۔

شبانہ واپس لوٹی تو اس کے انداز میں سکون کا ایک ہلکا سا رنگ تھا، جیسے تھوڑا سا خود کو سمجھ آئی ہو۔ فاروق نے دروازہ کھولا، اور کچھ لمحے شبانہ کو دیکھتا رہا۔

''آ گئی ہو؟''

''ہاں...''

''ٹھیک ہو؟'' شبانہ چونکی - فاروق نے مدتوں بعد کوئی فکر جتانے والی بات کی تھی۔

''ہاں۔ اب بہتر ہوں۔

''فاروق نے سر ہلایا۔

''اچھا ہے۔''

وہ پلٹ گیا، مگر اس کے چہرے پر کچھ تھا...... شاید نرمی، شاید پچھتاوا، یا شاید دیر سے جاگی ہوئی کوئی انسیت۔

اُسی رات جب شبانہ چائے بنا کر لائی تو فاروق نے ایک کپ اُس سے لیتے ہوئے کہا،

''تم نے ٹھیک کہا تھا، کبھی...... کہ دیواریں بڑھنے لگی ہیں۔''

شبانہ نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا۔

''ہاں...... میں نے کہا تھا۔''

''مجھے احساس نہیں تھا...... کہ خاموشی بھی ایک جرم بن سکتی ہے۔

''شبانہ کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔

''خاموشی کبھی کبھار محبت کو دفنا دیتی ہے، فاروق۔''

کمرے میں سناٹا تھا...... لیکن آج کا سناٹا اجنبی نہیں تھا۔ یہ وہ سناٹا تھا جو کسی پرانی، بچھڑی ہوئی محبت کے قدموں کی چاپ سننے سے پہلے چھا جاتا ہے۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا...... اور ان کے درمیان جو خالی پن برسوں سے حائل تھا، آج پہلی بار تھوڑا سا سمٹا اور کمرے میں خوشگوار مہک محسوس ہونے لگی۔

☆☆☆☆☆

حوصلہ

محمد شفیق

آج ہسپتال میں بیٹھا ہوا میں سوچ رہا تھا کہ ہمارے اندر تحمل اور برداشت کی کتنی کمی ہوگئی ہے۔ جو آج ہم چھوٹی چھوٹی باتوں پر خودکشی جیسے برے اور قبیح فعل پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ کتنی معمولی بات تھی میری اور میری ماں کی اور میں غصے میں آکر اپنا آپ کھو بیٹھا اور اپنی جان کا دشمن بن گیا اور اپنے اوپر فائر کھول دیا۔ اب اگر چچا مجید اور محلے والے عین وقت پر ہسپتال نہ لے آتے اور ڈاکٹر آتے ہی میری گولی نہ نکالتا تو شاید آج میں زندہ نہ ہوتا۔ یہ ہمارے اندر کیسا رویہ پروان چڑھ رہا ہے۔ یہ ہم کس طرف بھاگے جا رہے ہیں۔ پچھلی رات راؤنڈ پر آنے والے سرجن نے بھی یہی کہا کہ ہماری نوجوان نسل کو پتہ نہیں کیا ہوتا جا رہا ہے۔ چھوٹی چھوٹی اور معمولی باتوں پر بھائی بھائیوں سے، بیٹے باپ سے، بیٹیاں ماؤں سے اور دوست دوستوں سے دلبرداشتہ ہو کر خودکشی جیسا بزدلانہ اور حرام فعل سرانجام دے دیتے ہیں۔ مجھے آج ہسپتال میں اس چیز کا شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ کاش میں نے تاؤ میں آکر اپنے

اوپر فائر نہ کیا ہوتا یہ میری کتنی بڑی بیوقوفی تھی جسے میں اپنی بہادری اور والدین کی سزا سمجھ رہا تھا۔ دراصل وہ میرا اپنا ہی نقصان اور سزا تھی۔ اب اگر گولی وقت پر نہ نکال لی جاتی تو میں ہمیشہ کے لیے معذور بھی ہو سکتا تھا یا خدانخواستہ میری موت سے میری اپنی ہی زندگی کا ہمیشہ کیلئے خاتمہ بھی ہو سکتا تھا۔ کیوں انسان اتنا جلد باز اور جذباتی ہو گیا ہے۔ جو عام سی باتوں پر اپنی جان کا دشمن بن جاتا ہے۔ اور اپنی ہی جان لے کر یہ خیال کرتا ہے کہ میں نے دوسروں سے انتقام لے لیا ہے۔ خودکشی نہ صرف اسلام میں بلکہ دنیا کے ہر مذہب میں حرام ہے۔ کیسے خوب صورت نوجوان اور موٹے تازے معمولی سی بات پہ جذبات میں آ کر نہ صرف اپنی زندگی کا خاتمہ کر دیتے ہیں بلکہ اپنے والدین کے لیے بھی ہمیشہ کا رونا دھونا چھوڑ جاتے ہیں۔ زندگی اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ایک خوب صورت امانت ہے۔ اس کا خیال رکھنا اور خوب صورت انداز سے گزارنا بھی ایک اہم مذہبی فریضہ ہے۔ مجھ جیسے کیسے خوب صورت نوجوان اپنی زندگی کا خاتمہ کر کے نہ صرف اپنے لواحقین کے لیے بلکہ دنیا کے لیے بھی درسِ عبرت بن جاتے ہیں۔ آج مجھے ایسے تمام نوجوان یاد آ رہے ہیں کہ جنہوں نے معمولی باتوں کے لیے اپنی حیات کا چراغ ہمیشہ کیلئے گل کر دیا تھا۔ اپنے محلے کا نوجوان ارشد جس کی ابھی نئی نئی شادی ہوئی تھی اور بیوی سے ہر وقت تو تکار رہتی تھی۔ ارشد کی کیسی خوب صورت زندگی تھی ہسپتال میں گورنمنٹ کی ملازمت تھی۔ اور پُر امن ماحول تھا کہ ارشد نے ایک دن اپنی بیوی سے جھگڑے کے بعد کالا پتھر کھا کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا۔ اسی طرح مین بازار میں دکان پر کام کرنے والا چاچا حسن جس نے بیٹوں کے ہاتھوں تنگ ہو کر گندم میں رکھنے والی گولیاں کھا لی تھیں۔ اگرچہ ہسپتال لانے پر چاچا حسن کے معدے کو واش کرنے کی بہت کوشش کی گئی مگر اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی اور گولیاں اپنا کام کر چکی تھیں۔ اس کے علاوہ بھی کتنے لوگ ہیں جنہوں نے عام سی باتوں کے لیے اپنی قیمتی زندگی کا دیا بجھا دیا تھا۔ یہ اللہ پاک کا خاص کرم ہے کہ چچا مجید اور محلے والوں کے بروقت ہسپتال لانے پر میری زندگی بچ گئی ہے۔ کاش میں یہ نصیحت سب کو کر سکتا کہ زندگی کے تمام مسئلوں کا کوئی نہ کوئی حل موجود ہوتا ہے۔ مگر زندگی کا دیا بجھانے

کے بعد اس کو روشن کرنے کا کوئی حل نہیں ہوتا۔ آج نجانے کیوں مجھے یہ سب خود کشیاں کرنے والے یاد آ رہے ہیں۔ ہمارے شہر کے دوسرے محلے میں غلام حسین مزدور کی بیوی نے کیسے گھریلو حالات سے تنگ آ کر کالا پتھر کھا لیا تھا اور جب اس کو ہسپتال لے جایا گیا تھا تو ڈاکٹروں نے کہا تھا کہ اس کا معدہ پھٹ چکا ہے اور اب وہ زندہ نہیں بچ سکے گی اور واقعی ایک دو گھنٹے بعد اس کا انتقال ہو گیا تھا۔ نہ جانے لوگ اتنے غصیلے اور جذباتی کیوں ہو جاتے ہیں کہ اپنی ہی زندگی کا خاتمہ کر دیتے ہیں۔ اسی طرح ہمارے پڑوسی امان اللہ کے بیٹے نے بھی گھریلو حالات سے تنگ آ کر شہر سے دور بہنے والی بڑی نہر میں چھلانگ لگا دی تھی۔ جس کے گم ہونے کا بھی پہلے پتہ نہیں چلا تھا بعد میں ڈھونڈنے پر کسی نے بتایا کہ ہم نے اسے بڑی نہر کی طرف جاتے دیکھا ہے اور پھر شک کی بنیاد پر جب نہر میں تیراک لوگوں کو ڈھونڈنے کے لیے اتارا گیا تو چار پانچ کلومیٹر دور اس کی لاش ملی تھی جس کی حالت بھی آبی درندوں نے خراب کر دی تھی۔ اسی طرح نانا جان کے شہر میں بھی ایک نوجوان ہارون نے اپنے آپ کو کرنٹ لگا کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر دیا تھا۔ اُس وقت ہم بھی نانی اماں کے گھر گئے ہوئے تھے۔ کیسے ان کے گھر میں کہرام مچا ہوا تھا۔ اور ہارون کی ماں اور باپ کیسے دردناک انداز میں ماتم کر رہے تھے۔ مگر ہارون اس فانی دنیا کو چھوڑ کر جا چکا تھا اور اب ان کے والدین کے مقدر میں آہیں اور سسکیاں ہی رہ گئی تھیں۔ کیوں یہ خودکشی کرنے والے بشمول میرے یہ نہیں سوچتے کہ ہمارے بعد ہمارے والدین کا کیا ہوگا۔ ہمارے بہن بھائیوں کا کیا ہوگا۔ کاش انسان تھوڑا سا غصہ جذب کر کے اس اَبدی نقصان سے بچ جائے۔ اگر انسان میں حوصلہ اور برداشت ہو تو انسان خودکشی جیسے حرام فعل کی طرف آمادہ نہیں ہوتا۔ یعنی آج ضرورت ہے تحمل، برداشت، حوصلہ، رواداری اور حلم کی اور میرے خیال میں سب سے بڑھ کر اسلامی علوم کی بھی ضرورت ہے جس سے انسان کو نہ صرف اپنی دنیا بلکہ دائمی زندگی یعنی آخرت کے بھی برباد ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ اور انسان پھر تدبر اور حوصلے کا دامن تھامتے ہوئے خودکشی جیسے مذموم فعل سے باز رہتا ہے۔

☆☆☆☆☆

ماں

مر جانا--- مگر مارے بغیر واپس نہ آنا---

میری زندگی لگی ہے تم پہ--- میری زندگی کو بار کرمت آنا--- مجھے تم غازی قبول ہو لیکن اگر شہادت کا شرف ملے تو واپس نہ پلٹنا--- مجھے غازی سے شہید بیٹا زیادہ قبول ہے--- تمہارے باپ نے بھی اس وطن پر جان قربان کی تھی--- یاد رکھو تم بھی یہی کرو گے--- وہ اپنے لخت جگر کے سینے پر پاکستان کے پرچم کا بیج لگاتے ہوئے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر بڑے دلیرانہ انداز سے کہہ رہی تھی---

وہ ماں کے التجائی آرڈر پر اثبات میں سر ہلا رہا تھا---

میری دعا ہمیشہ تمہارے ساتھ رہے گی--- اب جاؤ کہتے ہوئے وہ پلٹ گئی تھی--- جیسے اسے اپنی ممتا کے ہاتھوں مجبور ہوتے ہوئے ضبط کے ٹوٹنے کا شدید خدشہ ہو---

ماں---

اس نے پیٹھ دکھاتی ماں کو جاتے دیکھ کر کہا تھا--- مگر وہ نہیں پلٹی تھی کہ کہیں وہ اس کے آنسو دیکھ کر کمزور نہ پڑ جائے---

وہ ایک لمحے کے لیے رکی اور اسی طرح قدم بڑھاتے ہوئے کمرے کا دروازہ بند کر چکی تھی---

بیٹا جا چکا تھا--- اور سرحد پر دشمن سر پر چڑھ آئے تھے--- وہ سرحد کی حفاظت کرنے کے لیے اپنے سینے پیش کر چکے تھے--- گرم تند ہواؤں میں بھی وہ ماں کی دعاؤں کی ٹھنڈک محسوس کر سکتا تھا---

وہ دشمن کو ناکوں چنے چبوا چکے تھے--- وہ سرحد پر پرچم لہرا چکے تھے---

یا اللہ--- میرے ملک کی حفاظت فرما--- میں نے میری جمع پونجی تیرے حوالے کی--- اللہ تو اس سے اپنے دین کی خوب حفاظت کا کام لے--- اللہ میرے بیٹے وا س زمین کے لیے مر مٹنے کی ہمت اور طاقت عطا فرما--- وہ جائے نماز پر بیٹھی بیٹے کی نہیں اسلام کی فتح کی دعا مانگ رہی تھی--- وہ زینب بنت علی نہیں تھی مگر وہ ان کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش خوب کر رہی تھی---

ماں---

وہ دعا مانگتے رک گئی تھی--- اور نظر اٹھا کر بیٹے کو سامنے کھڑا دیکھ رہی تھی--- وہ بیٹے سے نہیں ملی کہ جائے نماز پر رکھے قرآن پاک سے لپٹ گئی تھی---

وہ ماں کے برابر بیٹھ چکا تھا--- اور اسے تھامنے کی کوشش کر رہا تھا--- ماں اپنے بیٹے کی جیت پر اس سے لپٹ رہی تھی اور خدا کا شکر ادا کر رہی تھی کہ اس نے اس کی جمع پونجی کو فتح نصیب کی---

ماں بھوک لگی ہے---

وہ اپنی روتی ماں کے ہاتھ چومتے ہوئے بول رہا تھا--- وہ بیٹے کی فاقوں کے بعد کی بھوک دیکھ کر تڑپ گئی تھی۔

وہ کچن کی طرف بڑھ رہی تھی جب اسے سنائی دیا مجھے نہیں---

وہ بول رہا تھا جس پر وہ پلٹی تھی اور حیرت سے دیکھ رہی تھی انہیں---

وہ دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کھڑے باقی ساتھی سپاہیوں اور مجاہدوں کی طرف اشارہ کر رہا تھا---

"ماں سے ممتا ہوتی ہے" سب نے مل کر ماں کے ہاتھ چومے--- اور وہ ان کو نوالے بنا بنا کر دے رہی تھی--- وہ ان کے فاقوں کی بھوک مٹانے کی انتہائی کوشش کر رہی تھی۔

☆☆☆☆☆

ماریہ انور

کالا بکرا

وہ ایک لا اُبالی سا نوجوان تھا۔ والدین اس کو دیکھ دیکھ پریشان ہوتے کہ اس کا کیا ہوگا۔ کب وہ اپنی ذمہ داریوں کو سمجھے گا۔ کب ذمہ داریاں اٹھانا سیکھے گا۔ کسی نے اس کی شادی کرنے کا مشورہ دیا کہ بیوی خود ہی سیدھا کرے گی۔

اور شادی نے سچ میں اسے یکسر بدل دیا۔ دوست، احباب رشتہ دار ہر کسی سے توجہ ہٹا کر صرف اہل خانہ پر پوری توجہ مرکوز کر لی۔ اللہ پاک نے اگلے سال اولاد کی نعمت سے نوازا تو اس کی توجہ اور بڑھی۔ پھر وہ زندگی بھر بیوی بچوں کی دیکھ بھال اور خدمت میں مصروف رہا۔ ساٹھ سال کی عمر میں مہلک اور موذی مرض میں مبتلا ہو کر ہسپتال جا پہنچا۔

ایک دن اس نے دس لاکھ روپے کا اوپن چیک بڑے بیٹے کے سپرد کیا۔

"میرے بچنے کا امکانات اب بہت کم ہیں ہسپتالوں کے اخراجات کے لیے یہ رقم رکھ لیں ضرورت پڑے گی۔

ہاں، اتنا کرنا ایک کالا بکرا خرید کر صدقہ کر دینا، میں بہت تکلیف میں ہوں تاکہ قدرت اس کے وسیلے میری تکلیف کم کر دے اور وقت نزع روح پرواز کرنے میں کم دشواری ہو"

بیوی اور بیٹے نے یک زبان ہو کر کہا

"اچھا اچھا کر دیں گے، کر دیں گے۔ آپ فکر نہ کریں۔ کالے بکرے کا صدقہ ہو جائے گا"

باپ کو ہسپتال کے عملہ کے سپرد کر کے وہ لوگ رات کو آرام کی غرض سے اپنے گھر چلے گئے۔

رات کے پچھلے پہر بابا کی طبیعت زیادہ خراب ہوئی تو ورثا کو ایمرجنسی کال کے ذریعے بلوایا گیا۔

ورثا کے ہسپتال پہنچنے میں اتنی تاخیر ہوئی کہ باپ نے ہسپتال کے عملہ سے بس ایک بات کہی اور خالقِ حقیقی سے جاملا

"میرے ورثا سے بس اتنا پوچھ لینا کہ انھوں نے کالا بکرا صدقہ کیا تھا۔۔۔

☆☆☆☆☆

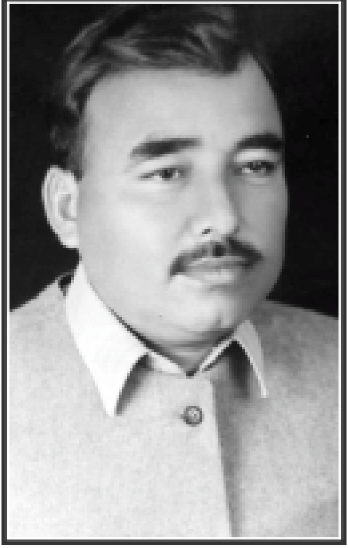

عاصم بخاری

لمحے ٹھہرتے نہیں [مائیکروفکشن]

گلی کے نکڑ پر چائے والے کی دکان سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ بارش کی بوندیں آنسوؤں کے ساتھ چہرے پر ملنے لگیں تو جمشید نے نگاہ آسمان کی طرف اٹھائی۔ آنکھوں سمیت ہر شے بھیگ رہی تھی۔ آسمان، زمین، چائے والے کی دکان اور سڑک کے سامنے مقیم قبرستان میں بنی چار دن پرانی زہرہ کی قبر۔ وہ قبر، جس پر بارش کے قطرے جذب ہو کر گیلی مٹی کی خوشبو بکھیر رہے تھے۔

چائے والے نے کپ دھپ سے میز پر اس کے سامنے رکھا تو جمشید کی نگاہ کا زاویہ بدلا۔ اب وہ چائے میں بارش کے قطرے گم ہوتے دیکھ رہا تھا۔ قطرہ چائے میں ڈوب کر چائے کا حصہ بنا اور ذرا سے ارتعاش کے بعد چائے میں گم ہو گیا یوں جیسے کبھی تھا ہی نہیں۔۔۔ انسان بھی تو موت کے بعد ایسے ہی غائب ہو جاتا ہے۔

جمشید نے کپ ہاتھ میں لیا۔ گرمی ہتھیلیوں میں اتری، لیکن دل اب بھی برف سا سرد تھا۔ کپ کی بھاپ میں اسے ایک پرانا منظر دکھائی دیا۔ زہرہ کھڑکی کے پاس کھڑی چائے کے گھونٹ لیتے ہوئے ہنس رہی تھی، اس کی ہنسی کی کھنک بارش کے شور میں گھلی بہت بھلی معلوم ہو رہی تھی۔ اڑتی بھاپ کے ساتھ وہ منظر ہوا میں ہی تحلیل ہو گیا۔

لیکن جمشید کے دل کا بوجھ اور بڑھ گیا۔ زہرہ چلی گئی تھی، پر دنیا؟ دنیا اپنی حرکت میں تھی۔ گلی کے بچے اب بھی ہنستے کھیلتے تھے، ٹھیلے والا اب بھی آوازیں لگاتا تھا، اور آسمان پر پرندے وہی دائرے کاٹ رہے تھے۔

کسی شے میں فرق نہیں آیا تھا۔ وہ سوچتا رہا۔ زہرہ اس کی دنیا تھی، مگر اس کے جانے کے بعد بھی وہ سانس لے رہا تھا، چائے پی رہا تھا، رات کو سو رہا تھا۔ دھڑکن چل رہی تھی۔ فرق بس تھا تو یہ کہ پہلے زندگی محبت اور ذمہ داری کا نام لگتی تھی اور اب بس وقت گزاری۔

جمشید نے کپ میز پر رکھ دیا۔ دل میں ایک سرگوشی ابھری۔ زندگی اب بس رکے ہوئے لمحوں کی مسافت کا نام ہے۔ وہ اٹھا، جیب سے کچھ سکے نکال کے میز پر رکھے اور آہستہ قدموں سے قبرستان کی طرف چل دیا۔ بارش کی خوشبو ہوا میں گھل رہی تھی۔ درختوں کے پتے بارش کی بوندوں سے بوجھل جھک رہے تھے اور قبروں کے بیچ کی مٹی نرم ہو چکی تھی۔

لمحے جنم لے رہے تھے، مٹ رہے تھے، کبھی نہ پلٹنے کے لیے، کبھی نہ بدلنے کے لیے۔

☆☆☆☆☆

صفورا پرویز

غزل

بکھر گئیں سبھی سطریں گلِ گماں کی طرح
کتابِ ہجر کھلی ، مطلعِ خزاں کی طرح

شکستگی میں بھی ہم اس کے پاؤں پڑ نہ سکے
کھڑے رہے کسی گرتے ہوئے مکاں کی طرح

لباسِ خاک میں سوگل چھپائے پھرتے تھے
ہم اپنے گرد تھے ، دیوارِ گلستاں کی طرح

دکھوں کی لہر ، نئے ساحلوں کی سمت چلی
قبائے رمز کھلی بندِ بادباں کی طرح

اسی کی گونج تھے ہم ، وقت کی پکار تھا وہ
ہمارا ساتھ رہا جسم اور جاں کی طرح

ہمارے دستِ دعا نے اسے سمیٹ لیا
جو ہم پہ آن پڑا ، رات ، آسماں کی طرح

غبار ہو گئے اس کی نشاں دہی کے لیے
ہم اس کی رہ پہ رہے گردِ کارواں کی طرح

ہوا کے دوش پہ اب تک سفر میں ہیں خالد
ہم اپنے شہر سے نکلے تھے ، داستاں کی طرح

خالد احمد

غزل

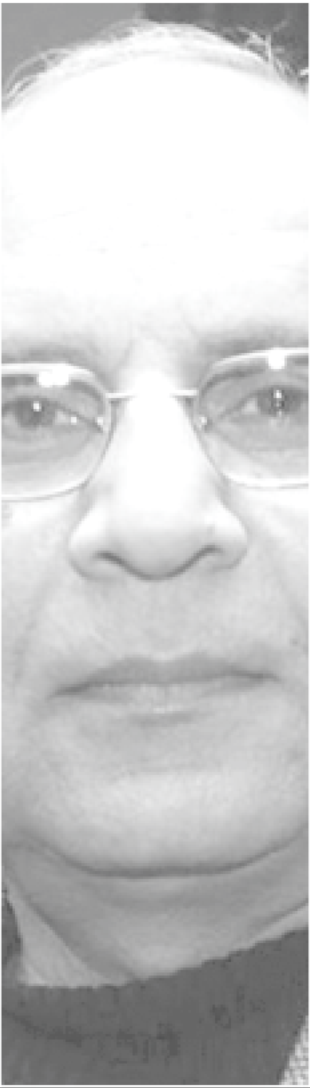

اک درد نے نکال دیے دل سے ڈر تمام
اب گُل ہیں اپنے واسطے برق و شرر تمام

جب اڑ رہے تھے لوتھڑے جسموں کے شہر شہر
تھیوری پہ لبھوٹ تھا نقد و نظر تمام

جھلکا ذرا ستم کے نہ ماتھے پہ انفعال
ڈوبے غزہ کے رنج میں کوہ و کمر تمام

دیکھو فرازِ وقت سے، بہتے لہو نے کیا
نقشہ جہاں کا کر دیا زیر و زبر تمام

نکلے تھے ہم تلاشِ حقیقت میں اور ہُوا
اک بحرِ بے کنار پہ جا کر سفر تمام

اک موجۂ ہوا کی حکومت تھی باغ پر
وہ جس طرف گیا گئے طائر اُدھر تمام

اک اک جھلک ہزار فسانے بنا گئی
پائی کہاں کسی نے پر اس کی خبر تمام

زعمِ ہنر لہو میں اُترنے کی دیر تھی
رخصت ہوا کلام سے عالی اثر تمام

جلیل عالی

غزل (بزمینِ خالد احمد)

تکتے ہوئے خوشوقت ہوا ہو گا خضر بھی
دریائے تنک آب کے برلب مرا گھر بھی

بیٹھے ہوئے دکھلائی دیے ہوں گے عموماً
دیوار کے سائے میں مری اک دو نفر بھی

کس برتے پہ اک وجہ پہ دعوائے فضیلت
خر ہی خرِ عیسیٰ بھی ہے دجّال کا خر بھی

کیا جھوٹ ہے کیا سچ ہے پتہ چل نہیں سکتا
باتوں میں نجومی کی اگر بھی ہے مگر بھی

اربابِ سیاست کہ بہر بابِ سیاست
سارے ہیں فرشتے نہیں کیا کوئی بشر بھی

یاجوج بھی ماجوج بھی سب چاٹ رہے ہیں
اس آس پہ دیوار میں بن جائے گا در بھی

جو مر گئے فاقوں سے نہ ہو پائیں گے یوں سیر
آٹے سے دیا جائے اگر قبر کو بھر بھی

آواز تھی الفاظ نہ تھے جھوٹ تھا مفقود
الفاظ سے دنیا یہ بنی جھوٹ مگر بھی

آنا تھا مگر دور سے، پہنچی نہیں، تھک کر
ستا رہی ہو گی کہیں رستے میں سحر بھی

ٹوپی وہ جو تھی قائد اعظم کی، ہے مجہول
ہے ہار گلے میں جو گئی سر سے اتر بھی

تیری مری حرص اور ہوس سے ہیں گرانقدر
کنکر ہیں حقیقت میں یہ لعل اور گہر بھی

آنکھوں میں لگایا تو گلے تک اتر آیا
سُرمے سے ہوئے گُنگ گئی ساتھ نظر بھی

ظاہر ہے کہ فائق ہے تصوف پہ تفلسُف
ہے فلسفہ علم اس کے علاوہ بھی ہنر بھی

ہر قافیہ پیا ہے فقط یاروں میں اشعر
موزوں نہ ہوا ہو کبھی اک مصرعِ تر بھی

ہے دھیان جو پہنچا تو وہ رب ہو کہ ہو محبوب
پاؤ گے اسے سامنے جاؤ گے جدھر بھی

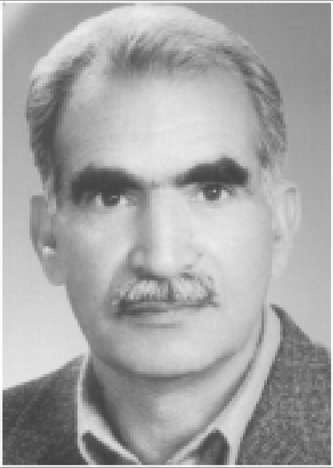

محمد ارشاد

غزل

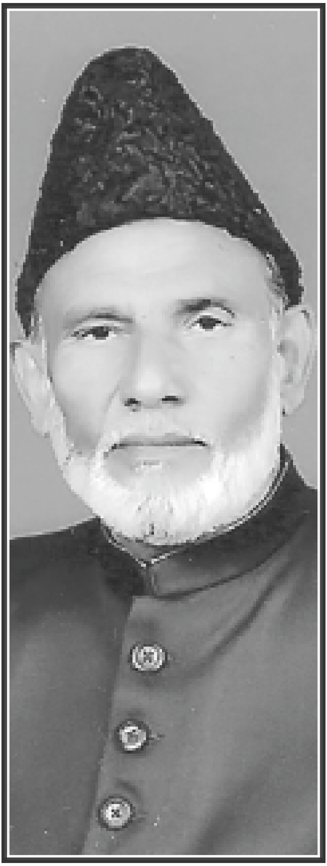

وہ خواب میں بھی کسی کا آنچل، کسی کا دامن تلاش کرنا
جفا کی جلتی ہوئی رُتوں میں وفا کا ساون تلاش کرنا

کبھی جو سیرِ چمن کو جانا تو رُک کے چلنا ٹھٹھک کے رُکنا
کبھی درختوں پہ نام لکھ کر دلوں کی دھڑکن تلاش کرنا

اُسے مخاطب سمجھ کے شب بھر وہ خود کلامی کی ایک لذت
وہ بھیجنے کو پیامِ الفت صبا کا دامن تلاش کرنا

جسے نہ راس آئے دوستوں کے حسین وعدے، حسین باتیں
وہ ہو کے مایوس چاہتا ہے وفا کے دشمن تلاش کرنا

کریہہ چہرے بصارتوں پر گراں گزرتے ہوں جب چمن میں
تو دشت و صحرا کی وسعتوں میں حسین مدفن تلاش کرنا

شریف ساجد

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کم نظر روتے رہے ہم نظروں کا رونا
دیکھتا کون ترے دیدہ وروں کا رونا

غزل

سر جھکا کر قدم یار پہ قرباں ہونا
میری قسمت میں تھا اِس طرح مسلماں ہونا

جس کا مذہب ہو فقط دیدِ صنم یادِ صنم
جانتا ہے وہی کافر یا مسلماں ہونا

جس کا دل گیسوئے واللیل کے سائے میں رہے
اُس کو بجتا نہیں دُنیا میں پریشاں ہونا

اُن کی اُمت میں ہیں یہ فخر بجا ہے لیکن
ہم پہ لازم ہے ہر اک رُخ سے مسلماں ہونا

زیرِ خنجر بھی نہ چھوڑے جو محبت کی زمیں
اُس کو کہتا ہے فلک زینتِ ایماں ہونا

وہ طرب زار فضاؤں سے سدا دُور رہا
اُن کے غم میں جسے آتا نہ ہو شاداں ہونا

سُرخروئی کا سبب حُسنِ ندامت ہی تو ہے
اُن کو بھاتا ہے گناہوں پہ پشیماں ہونا

یہی توحید ہے تعظیم ہے تسلیم بھی ہے
جان دے کر نہ کبھی شاکئی جاناں ہونا

اِسی اعزاز سے افضل بھی ہوا اعلیٰ بھی
اوج در اوج ہے جبریلؑ کا درباں ہونا

پیکرِ حُسن پہ دانش ہوئی جب دل سے نثار
نازِ دانائی ہوا عشق میں ناداں ہونا

شوکتِ نعت نے بخشی ہے مجھے شانِ بلند
ورنہ مشکل تھا بہت مرا سُخن داں ہونا

اُن کی صورت میں نظر آئے خدا کے جلوے
اُن کی سیرت کو بجا کہتے ہیں قرآں ہونا

کم تری عاجزی و خاک نشینی سبطین
ہے یہی عشق کی دنیا میں نمایاں ہونا

شاہ محمد سبطین شاہجہانی

غزل

ذکرِ شبیر سے نکل آیا
خون تحریر سے نکل آیا

آنکھ اُس کی نہ پھر لگی جس کا
خواب تعبیر سے نکل آیا

عذرِ تخریب گر پسِ پردہ
شوقِ تعمیر سے نکل آیا

تم گئے تو نہ لوٹ پاؤ گے
میں تو تقدیر سے نکل آیا

فصلِ گُل آئی میرے گھر سبزہ
چھت کے شہتیر سے نکل آیا

میری تنہائی بانٹنے راحت
کوئی تصویر سے نکل آیا

راحت سرحدی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

راستے بھر کیا یونہی ہم کو پکارے جائیں گے
ساتھ دریا کے کہاں تک یہ کنارے جائیں گے

غزلیں

غلط جو کہنا بھی چاہا، کہا گیا ہی نہیں
کہ دل سے فرقِ سفید و سیہ گیا ہی نہیں

تھی رسم و راہ گئے موسموں، مگر ایسی
نئی رُتوں، نئے موسم، جیا گیا ہی نہیں

یہ کس مقام پہ آ کر، بھٹک گیا ہوں میں
جہاں سے اور کہیں راستہ گیا ہی نہیں

ہر ایک شخص کے لب پر تھی داستاں اپنی
ہمارا قصہ کہیں بھی، سنا گیا ہی نہیں

جہاں اترتی مسافر پہ منزلوں کی سی شام
سفر نصیب، وہ رستہ دیا گیا ہی نہیں

بڑا سرور ہے، خُم خانۂ حیات کی مے
بھرا تو میں بھی پیالہ، پیا گیا ہی نہیں

ورق تمام ہوا اور ہے داستاں باقی
تھا ایک قصہ کچھ ایسا، لکھا گیا ہی نہیں

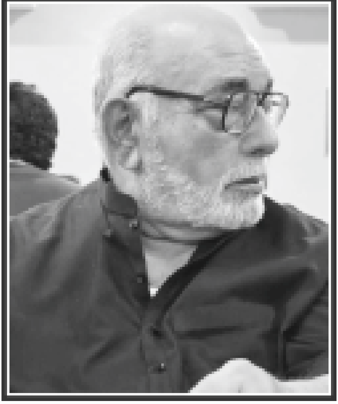

طارق بٹ

اپنا ہر گوشہ بے نقاب نہ کر
دلا، اس طور اضطراب نہ کر

تجھ پہ سجتی ہے تیری بے تابی
خود کو مہتاب، آفتاب نہ کر

غنچۂ لب ہو وا، حجابانہ
ورطۂ شوق میں، گلاب نہ کر

اپنی مہکار کو رچا خود میں
ہم رکابِ صبا، شتاب نہ کر

ان کہی کا ہے ایک، اپنا نشہ
دل میں رکھ بات، کچھ کتاب نہ کر

خود نمائی میں بھی رہے تہذیب
رنگ و بو اپنے، بے نصاب نہ کر

دیکھ، ان دیکھے موسموں کو ابھی
بند، پچھلی رتوں کے باب نہ کر

رونقیں ہوں گی پھر سے دل آباد
اپنی آرائشیں خراب نہ کر

سوزِ پیہم پہ ہے جو تیری اساس
کیوں کہوں، درد انتساب نہ کر

غزل

موت کا رقص، قیامت کا گماں ہوتا ہے
جیسا ہم دیکھتے ہیں، ویسا کہاں ہوتا ہے

کون سی رت میں ترے شہر میں آ سکتا ہوں
کون سی رت میں یہاں امن واماں ہوتا ہے

ہاں میاں! اس کے لئے ہوتے ہیں دفتر درکار
چند غزلوں میں کہاں درد بیاں ہوتا ہے

یاد رہتا ہے کہاں زخم لگایا کس نے
یعنی ہر زخم کا اک دل پہ نشاں ہوتا ہے

تیرا غم ساتھ مرے بوڑھا ہوا ہے لیکن
روز سو بار مرے دل میں جواں ہوتا ہے

شعر کہنے کو تو سب کہتے ہیں اکرم ناصر
شعر وہ ہوتا ہے جو وردِ زباں ہوتا ہے

اکرم ناصر

تنہائی سی تنہائی تھی، کرتا بھی تو کیا میں
سو، شہر میں صحرا کی طرح پھیل گیا میں

انتخاب
- خالد احمد -
نعمان منظور

غزل

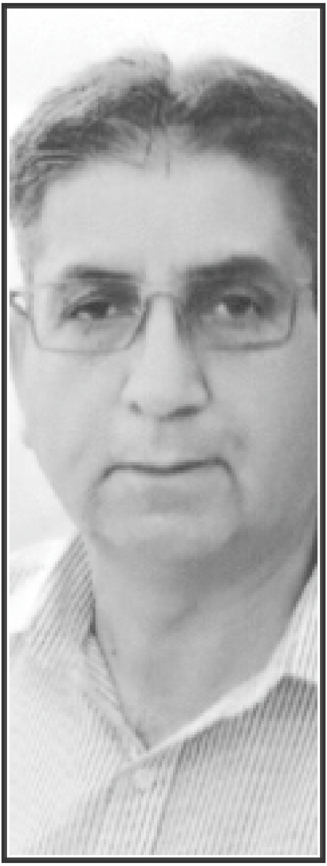

دوست پرسانِ حال کوئی نہیں
میرے دکھ کی مثال کوئی نہیں

اشک شوئی تو سب ہی کرتے ہیں
میرے غم میں نڈھال کوئی نہیں

کون بولے مری حمایت میں
جب مرا ہم خیال کوئی نہیں

دل میں تو خواہشیں ہزاروں ہیں
لب پہ لیکن سوال کوئی نہیں

ایک داؤ ہے ہارنے والا
عشق میں اور چال کوئی نہیں

میں نے تشبیہ دی تجھے تجھ سے
اس سے اچھی مثال کوئی نہیں

طالب انصاری

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

رنگ کہتے ہیں کہانی میری
کس کی خوشبو تھی جوانی میری

غزل

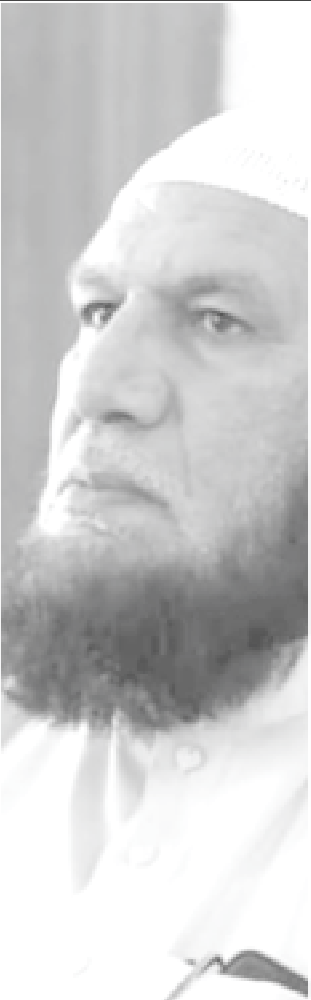

رضا اللہ حیدر

چمن کے پھولوں میں ہے انتخاب کیا کہنے
کہاں سے لائیں گے اس کا جواب کیا کہنے

وہ اس کی آنکھ میں رقصاں کرن ستاروں کی
وہ اس کے ہونٹ پہ کھلتے گلاب، کیا کہنے

وہ اس کی بات ترنم سا عندلیبوں کا
وہ اس کا چہرہ مقدس کتاب، کیا کہنے

کبھی وہ روئے تو ساون کے رنگ کھل جائیں
کبھی ہنسے تو ہنسے بے حساب، کیا کہنے

گھٹائیں چھا گئیں روشن دوپہر ماند ہوئی
جو رُخ پہ آیا حیا کا نقاب، کیا کہنے

وہ رنگ پہنے تو کھیلے صبا کے جھولے میں
فضا میں تھام کے دستِ سحاب، کیا کہنے

ابھی تو اور نکھرنا ہے رنگِ سیمیں نے
وہ کم سنی میں ہے رشکِ شباب، کیا کہنے

خمار آنکھ سے ٹپکا تھا وقتِ دید رضا
لگائی تہمتِ داغِ شراب، کیا کہنے

غزلیں

اس درجہ محبت کے گنہ گار نہیں ہیں
ہم ہجر کی سولی کے سزاوار نہیں ہیں

ہنستے ہوئے اس شہر کو یوں آگ لگا دیں
اتنے بھی اجالوں کے طلبگار نہیں ہیں

دکھ درد میں ہنسنے کا سلیقہ نہیں آتا
ہم عام سے بندے ہیں اداکار نہیں ہیں

بُھولے سے ہم آنکلے ہیں بازار کی جانب
کس کس کو بتائیں کہ خریدار نہیں ہیں

یہ لوگ ہماری بھی حمایت نہیں کرتے
یہ لوگ تمہارے بھی طرفدار نہیں ہیں

کچھ لوگ تماشا ہیں تو کچھ لوگ تماشائی
اس بھیڑ میں سارے ہی عزادار نہیں ہیں

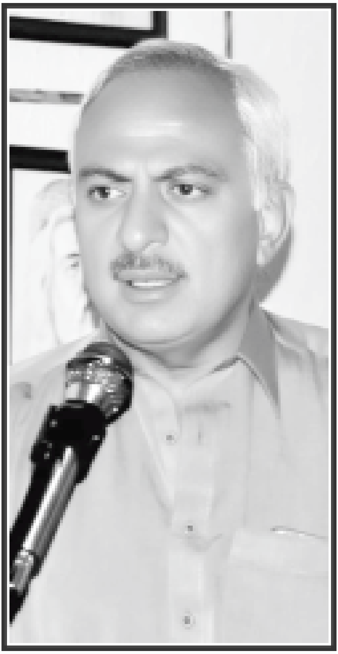

افتخار شاہد

خزاں کے ہاتھ جو پیلے نہیں ہیں
تمہارے باغ ہی اجڑے نہیں ہیں

کسی کا ذائقہ میٹھا بھی ہو گا
سبھی بادام تو کڑوے نہیں ہیں

ہمیں اس زلف نے باندھا ہوا ہے
ابھی ہم جیل سے چھوٹے نہیں ہیں

ترے رومال کا کرنا بھی کیا تھا
ہمارے اشک ہی ٹپکے نہیں ہیں

انہی کی منتظر تھی آنکھ شاہد
وہی جو قافلے ٹھہرے نہیں ہیں

غزل

وفا کے نام کیا روشنی کو رنگوں کو
سزائے موت ملی رات پھر پتنگوں کو

تمام رات رہا موج میلہ قبروں پر
مرید بھنگ پلاتے رہے ملنگوں کو

چھلک رہے ہیں بھری گاگروں کی صورت میں
نچوڑتے ہیں جو ہر روز بھوکے ننگوں کو

انہی کے ہاتھ میں اپنا لہو تلاش کریں
گلی گلی میں جو پھیلا رہے ہیں دنگوں کو

ہوا کے جھونکے فقط اس کے گرد گھومتے ہیں
حیا ذرا بھی تو آتی نہیں لفنگوں کو

خدا کی مرضی سیاہی کرے سفیدی کرے
یہ تخت و تاج دیے اس نے بھیک منگوں کو

ہماری حرکتیں اس سے کہیں گری ہوئی ہیں
فضا میں اونچا کیا جس قدر ترنگوں کو

وہ خواب جاگ نہ جائیں ہماری آنکھوں میں
سلا کے لوریاں دیتے رہے امنگوں کو

ہمارے سر پہ محبت کی حکمرانی ہے
گلے لگایا ہے دل نے عجیب پنگوں کو

قصور کس کا ہے مسعود ابنِ آدم نے
خود اپنے سر پہ مسلط کیا ہے جنگوں کو

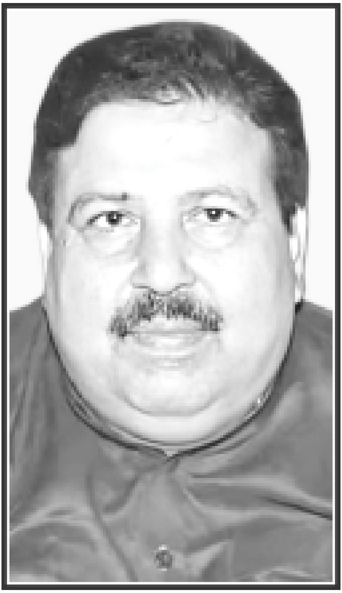

مسعود احمد

غزل

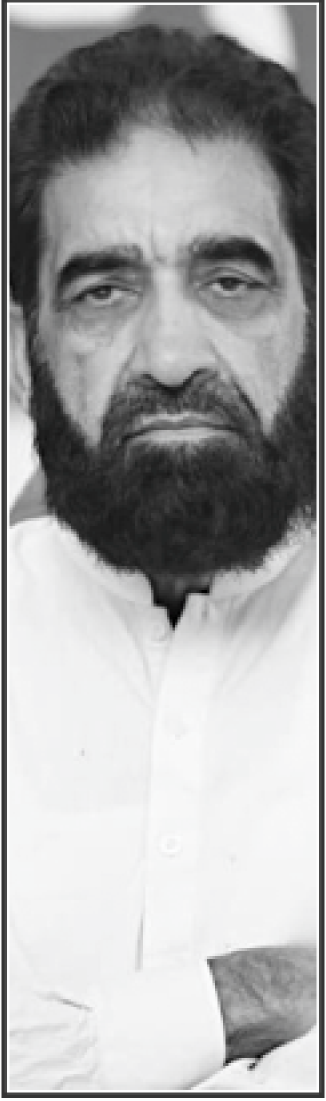

دامن کشا ہوا تو میں پر جوش ہو گیا
اک خاکسار آسماں بردوش ہو گیا

پتھر سے چشمہ پھوٹا تو حیرت نہیں ہوئی
ویرانہ بھی بہار میں گل پوش ہو گیا

لڑتا رہا ہوا سے اکیلا ہی اک چراغ
اور جب رکی ہوا وہ سیہ پوش ہو گیا

یہ زندگی ہے اصل میں جد و جہد کا نام
وہ مر گیا جو جیتے جی کم کوش ہو گیا

آنکھوں کے جام بھرتا گیا دل بھی بار بار
میں تشنگی میں اپنی بلا نوش ہو گیا

سناٹا بولنے لگا پچھلے پہر تو میں
ہر سمت یک بیک ہمہ تن گوش ہو گیا

میں بولتا تھا جب تو کوئی بولتا نہ تھا
پھر یوں ہوا کہ سعد میں خاموش ہو گیا

سعد اللہ شاہ

غزل

کسی خیال کسی خواب میں پڑا ہوا تھا
میں کچھ دنوں کے لیے چاند پر گیا ہوا تھا

میں جب بھی حد سے نکلنے لگا تو لوٹ آیا
مرا ضمیر مرے سامنے کھڑا ہوا تھا

وصالِ یار تری آخری جھلک کیا تھی
مرے علاوہ مرا ہجر بھی مَرا ہوا تھا

میں ایک خواب لئے پھر رہا تھا آنکھوں میں
اور ایک خواب مری میز پر رکھا ہوا تھا

پگھل کے بہنے لگا تو مجھے سکون ملا
بس ایک اشک مری آنکھ سے جُڑا ہوا تھا

جما ہوا تھا لہو بُوند بُوند کی صورت
مرا وجود کہیں برف میں رکھا ہوا تھا

کہاں سے روشنی اقبال آ گئی گھر میں
چراغِ آخرِ شب تو کہیں بُجھا ہوا تھا

اقبال سروبہ

غزل

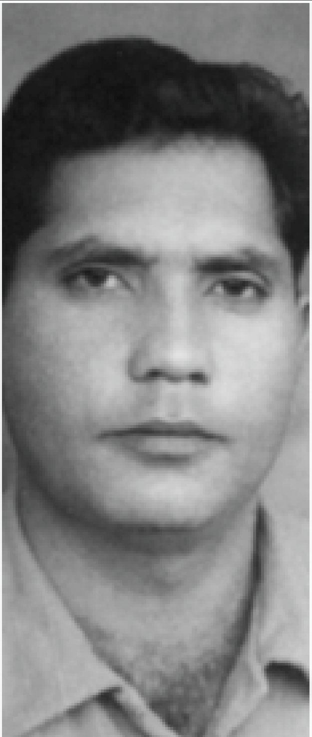

عرفان صادق

دل کے بے کار سے خدشات پہ آمین نہ کر
باتوں باتوں میں مرے عشق کی توہین نہ کر

آزمائش کے یہ لمحات گزر جائیں گے
مری آنکھوں میں مرے خوابوں کی تدفین نہ کر

گفتگو ٹھنڈی ہواؤں کا بدل ہوتی ہے
گھر کی دیواروں کی سناٹوں سے تزئین نہ کر

مذہبِ عشق شرائط کو کہاں مانتا ہے
اپنی شرطوں پہ چلا کر مجھے بے دین نہ کر

یار اپنوں کا نہیں ہاتھ جھٹکتے ایسے
یار ایسے تو انا اپنی کی تسکین نہ کر

دیکھتا کون ہے گہرائی میں جا کر عرفان
خون رو رو کے خیالات کو رنگین نہ کر

انتخاب

خالد احمد

نعمان منظور

کارگر کون رہا کارِ وفا میں خالد
کس کی قسمت میں ہے فرہاد کا تیشہ ہونا

غزل

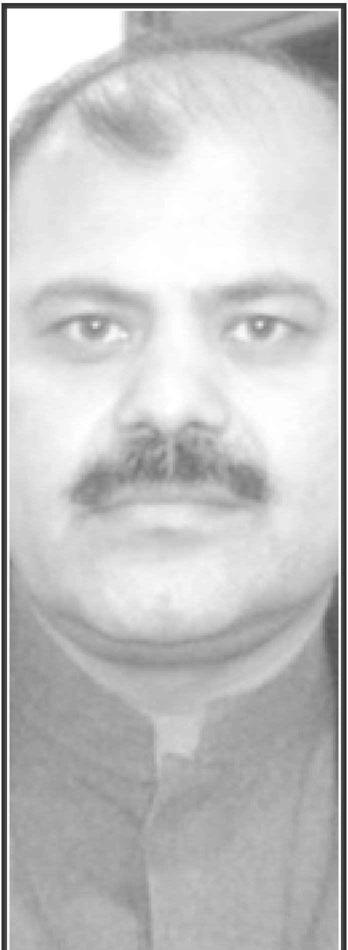

سارے اپنی بات کریں گے ہم کیوں پیچھے رہ جائیں
آگے سارے لوگ بڑھیں گے ہم کیوں پیچھے رہ جائیں

بادِ صرصر جس جانب ہو اس رہ پر ہو جائیں گے
دنیا تیرے ساتھ چلیں گے ہم کیوں پیچھے رہ جائیں

جینے کی جب شرط رکھی ہے مرنے کی کیا جلدی ہے
شہزادی تاوان بھریں گے ہم کیوں پیچھے رہ جائیں

خوابوں اور سرابوں میں کچھ نقش ہمارے زندہ ہیں
آندھی سے جب زرد لڑیں گے ہم کیوں پیچھے رہ جائیں

در، دیوار کی گریہ زاری تنہائی میں جاری ہے
ہجر کا ماتم ساتھ کریں گے ہم کیوں پیچھے رہ جائیں

دونوں نے جب عشق کیا ہے جرم برابر ہے شاہد
پروانوں کے ساتھ جلیں گے ہم کیوں پیچھے رہ جائیں

شاہد فرید

غزل

بسنے اور بسانے کا، اک جہاں لیے پھرتا
سیلِ ذات میں اپنا، لامکاں لیے پھرتا

حیثیت بس اتنی تھی، راکھ ایک چٹکی بھر
الٹی اس ہتھیلی پر کیا جہاں لیے پھرتا

ایک دن لگا دیتا، قفل اپنے ہونٹوں پر
کیا پڑی تھی پھر اُس کی چابیاں لیے پھرتا

اک شگاف پڑتا تھا، اک شگاف بھرنے پر
خواب کے تغارے کو، میں کہاں لیے پھرتا

میرے پاؤں دھرتے ہی، آب راستہ بنتا
میرے پیچھے یہ ساحل، بادباں لیے پھرتا

شہر بھی تھا نابینا، اور مکین بہرے تھے
میں کہاں پہ رنگوں کی، داستاں لیے پھرتا

ہونے اور نہ ہونے کو، میں بھی اپنے برزخ کو
آگ اور جنت کے، درمیاں لیے پھرتا

اپنی چھت بکھرنے پر، اُس سے روٹھ جاتا میں
وہ مجھے منانے کو، دو جہاں لیے پھرتا

رنگ دھوپ کے سارے، بانٹ دیتا یاروں میں
ماند پڑتی شاموں کا، میں دھواں لیے پھرتا

فتح اور ہزیمت کے، کھیل سے ورا طاہر
ٹاس کے میں سکے کو، کیوں یہاں لیے پھرتا

قیوم طاہر

غزل

وہ جو ہیں دل کو دُکھانے والے
آنکھ سے نیند اُڑانے والے

کیسے سمجھوں میں مسیحا ان کو
وہ تو ہیں زخم لگانے والے

کر کے برباد تماشہ دیکھیں
ایسے ہوتے ہیں زمانے والے

وہ تو اب قصہء پارینہ ہوئے
اب کہاں دوست پرانے والے

سچ ہے احساس کا رشتہ ہے بڑا
سُن لے اے دل کو دُکھانے والے

دل ہے جس پہ اثر کب ہو گا؟
اے مرے شعر سنانے والے

اپنی دنیا میں ہے افروز مگن!
خواب آنکھوں کو دکھانے والے !!

افروز رضوی

غزل

ساکت جامد آئینے پر رِقت طاری کیسے ہو
اک دریا صحرائے چشم سے آخر جاری کیسے ہو

ماہ و مہر مثال نظر کو، جاگتے رہنا ہو کب تک
عکس میں نور آثار اب جانے ہجر کی ماری کیسے ہو

کیسے تھمے موجوں کا تموج لہر میں جب آجائے ہے
قلزمِ دل کے گرد بھلا اب چار دواری کیسے ہو

کیسے بہار آجائے تمھاری ایک جھلک سے گُل اندام
بادِ چمن ترے اک جھونکے سے سبز کیاری کیسے ہو

دور کے دیس سے شہزادہ بھی لوٹ کر اب نہیں آئے گا
موم کی صورت پتھر جسم یہ، راجکماری کیسے ہو

کاروبار کیے جاتے ہیں یوں تو اور بھی رخشندہ
شہرِ محبت میں لیکن سرمایہ کاری کیسے ہو

رخشندہ نوید

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

پسِ ذوقِ سخن ، ہزار سخن
پردۂ رنگ و بُو میں رہتے ہیں

غزل

تری طرف سے مری سمت جب بھی آتی ہے
ہوا بجھے ہوئے سارے دیے جلاتی ہے

یہ میرا گریۂ پیہم علاجِ غم تو نہیں
بس اتنا ہے کہ ذرا گرد بیٹھ جاتی ہے

کبھی جو کرتی ہے بے تاب عافیت کوئی
فضائے درد مرا حوصلہ بڑھاتی ہے

فلک سے آتے ہیں جلتے ہوئے حسیں موسم
زمین برہا کے مسرور گیت گاتی ہے

تجھے یقین کہ سب کچھ یونہی رہے گا سدا
مری نگاہ میں دنیا کی بے ثباتی ہے

یہ اُلجھنیں ہیں سلجھتی ہے زندگی جن سے
یہ تیرگی ہے جو رستے کئی سجھاتی ہے

عجیب شمعیں ہیں چھپتے ہیں خدوخال بھی
عجب اُداسی ہے چہروں کو جگمگاتی ہے

واصف سجاد

غزل

کبھی سوچا نہ گیا اور کبھی لکھا نہ گیا
میں ہی وہ شعر ہوں جو ٹھیک سے سمجھا نہ گیا

زندگی خود مجھے کہنے لگی، مر جا مری جاں
اس سے اس طرح تڑپنا مرا دیکھا نہ گیا

لب پہ تو مہر تکلف کی لگا لی میں نے
لیکن آنکھوں سے تو اصرار کا لہجہ نہ گیا

ہے عجب خواب میں پھیلے ہوئے پھولوں کی مہک
مجھ سے کانٹوں بھرے بستر پہ بھی جاگا نہ گیا

وہ تعلق کہ جسے جوڑ نہ پائے کبھی ہم
وہ تعلق بھی تو مجھ سے کبھی توڑا نہ گیا

ہاں ترے بعد بھی اٹھے ہیں قدم سوئے حیات
مجھ سے یہ بوجھ مگر روز اٹھایا نہ گیا

ساتھ جاتی ہے مری گوشہ نشینی بھی انیم
میں کبھی بزم میں احباب کی تنہا نہ گیا

ابو طالب انیم

غزل

ہے تجسس اس میں ہی انجام کا
گر نہ ہو شدت تو غم کس کام کا

تیرا ہونے کی سزائیں کاٹ لیں
مستحق ہوں اب ترے انعام کا

زندگی میں اپنی جب ہیں شب ہی شب
کیا کروں آئینۂ ایام کا

ابتدائے عشق جس میں تھی ہوئی
ذائقہ کچھ اور تھا اس شام کا

ہنستی آنکھوں سے چھلک جاتا وہ اشک
کچھ تو مطلب ہو گا اس ابہام کا

عشق کو دنیا سمجھ پائی نہ جو
فن ہے یہ دیوانۂ گلفام کا

کامیابی کی طلب میں ڈوب کر
بھول بیٹھا نام ہی آرام کا

دیکھ اخبار و رسائل تو کبھی
نام کتنا ہے ترے بدنام کا

آہ زاری کر کے سینہ پیٹ کے
کیوں تماشہ میں کروں آلام کا

ذکی طارق

غزل

نظر میں ہے ، جو باہر چل رہا ہے
مگر کیا ؟ دل کے اندر چل رہا ہے

کوئی سایہ ہے یا ہم زاد ، اپنا
کوئی اپنے برابر چل رہا ہے

سکوتِ شب میں کتنی خامشی ہے
سوئے منزل ، سمندر چل رہا ہے

اسیرِ زلف ہوتے جا رہے ہیں
کسی کا ہم پہ منتر چل رہا ہے

اُدھر بہتات ہے لطف و کرم کی
اِدھر تیرِ ستم گر چل رہا ہے

جدا ، آپس میں بھائی ہو رہے ہیں
تماشا خوب ، گھر گھر چل رہا ہے

بلا کی دھوپ ہے ، شدت کی گرمی
کہ جیسے روزِ محشر چل رہا ہے

ابھی اقدارِ پارینہ ہیں زندہ
پسر، راہِ پدر پر چل رہا ہے

بیاں ہونے سے جو قاصر ہے ، شوکت
پسِ پردہ ، وہ منظر چل رہا ہے

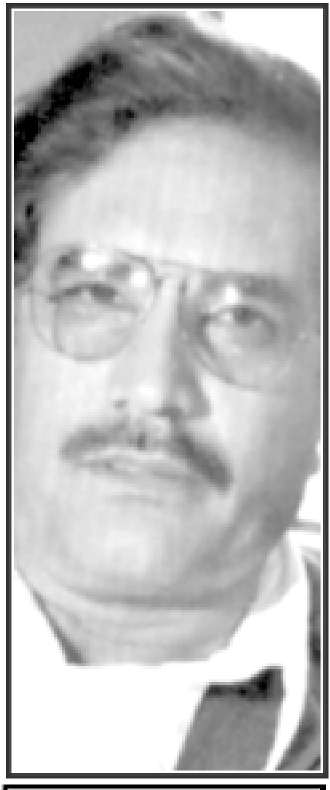

شوکت محمود شوکت

غزل

احمد جلیل

میں سوچتا تھا یہ مقتل کی سمت جاتے ہوئے
کہ سر تو جائے گا دستار کو بچاتے ہوئے

اُسے خبر ہی نہیں تھی یہ میرا حصہ ہے
وہ ڈر رہا تھا مجھے داستاں سناتے ہوئے

ندامتوں کے پسینے میں ڈوب ڈوب گیا
عجیب حال تھا اس کا نظر چراتے ہوئے

کہ روشنی کا امیں میں بھی ہوں، حقیر نہ جان
کہا تھا جگنو نے تارے کو جگمگاتے ہوئے

کبھی نہ سوچا تھا اس نے وہ ایسے بکھرے گا
مہکتے پھولوں کو گلدان میں سجاتے ہوئے

مجھے یہ زعم تھا مجھ سے جدا نہ ہوگا کبھی
بچھڑ گیا تھا جو ہاتھوں کو پھر ہلاتے ہوئے

میں جیت سکتا تھا اس سے مگر گوارا نہ تھا
میں خود سے ہار گیا تھا اسے ہراتے ہوئے

وہ کوئی غیر نہیں تھا جلیل اپنا تھا
میں اس کو دیکھتا جاتا تھا تیر کھاتے ہوئے

غزل

کوزہ گر چاک سے اُٹھا مجھ کو
مسندِ عرش پر بٹھا مجھ کو

تُو بھی تنہا ہے میں بھی تنہا ہوں
بیٹھ! اپنی کتھا سُنا مجھ کو

رستے متروک ہو گئے مجھ پر
اِک نیا راستہ دِکھا مجھ کو

پھول کِھلتے ہوں لوگ ملتے ہوں
ہے کہاں وہ جگہ بتا مجھ کو

عشق میں ہو رہی ہے سرشاری
چاہتا ہے مرا خدا مجھ کو

چُھو لیا اِک ذرا سا جو تُو نے
کر دیا ہے ہرا بھرا مجھ کو

بے خطا ہی نہ ماری جاؤں کہیں
کرنا ہو گی کوئی خطا مجھ کو

شُکر اتنا نہ کر سکی تیرا
جتنا تُو نے عطا کیا مجھ کو

شبہ طراز

غزل

ذکرِ جام و شراب میں گم ہو
کس جہانِ خراب میں گم ہو

ہم فضائیں کھلے سمندر کی
تم فصیلِ حباب میں گم ہو

ہم کسی فرق کے نہیں قائل
تم حساب و کتاب میں گم ہو

ہم کو سرگشتۂ تلاش کیا
خود خودی کے حجاب میں گم ہو

دوستو قیدِ ذات سے نکلو
کس مسلسل عذاب میں گم ہو

غم ہی ہوتا ہے گر کہیں روشن
یار دل کی کتاب میں گم ہو

اعجاز روشن

غزل

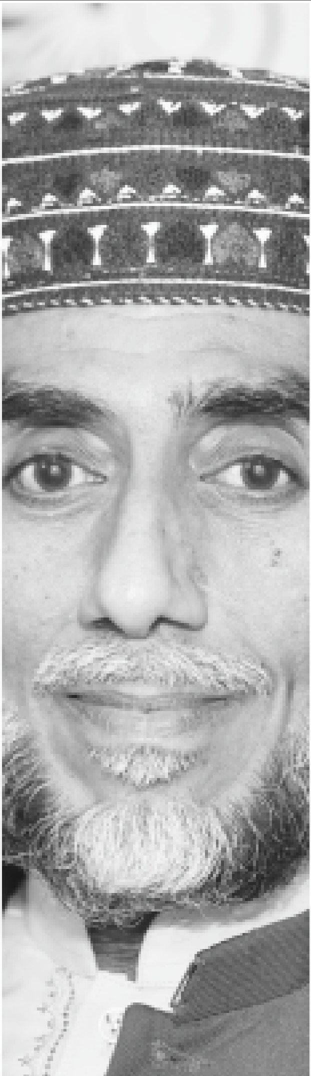

فیض رسول فیضان

ہستی کے اِس فریم کا نکتہ تو میں بھی ہوں
تسلیم کر نہ کر، ترا حصہ تو میں بھی ہوں

اثباتِ جاوداں کی تمنا نہیں مجھے
اے گردشِ زماں، کوئی لمحہ تو میں بھی ہوں

ارض و سما کی آنکھ ترستی رہی جسے
جلوہ تو میں بھی ہوں وہ نظارہ تو میں بھی ہوں

سینہ بہ سینہ، عہد بہ عہد آ رہا ہے جو
اُس رازِ معرفت کا خلاصہ تو میں بھی ہوں

اُفتادِ طبع کچھ بھی کہے، مان لیجے
رُودادِ کُن فکاں کا حوالہ تو میں بھی ہوں

فیضاؔن، میرؔ و غالبؔ و اقبالؔ زندہ باد
ادنیٰ سے شعر کا کوئی مصرعہ تو میں بھی ہوں

غزل

گلے میں چیخ اٹکی ہے
وہ سمجھے ہیں کہ ہچکی ہے

مری بے خواب آنکھوں میں
ضیا بن کر وہ رہتی ہے

کہیں پر دھوپ نکلی ہے
کہیں برسات برسی ہے

سبھی رشتے مقدس ہیں
مگر بیٹی تو بیٹی ہے

تری آنکھوں کی تابانی
ہر اک چہرے پہ بکھری ہے

وہ گھر کی بالکونی سے
کسی کی راہ تکتی ہے

فضا میں ساز بجتے ہیں
وہ جب دھیرے سے ہنستی ہے

مجھے اصغر بلانے سے
نہ جانے کیوں وہ ڈرتی ہے

وہاں پر پھول کھلتے ہیں
جہاں وہ پاؤں رکھتی ہے

میں اس کو بھول جاؤں تو
وہ مجھ کو یاد کرتی ہے

عجب ہے شام کا منظر
اداسی سی اداسی ہے

اصغر علی بلوچ

غزلیں

عزم و ہمت سے ہر مشکل کو آسان بنانا ہے
پاکستان بنایا تھا اور پاکستان بنانا ہے

بیخ کنی کرنی ہے ہم کو نفرت اور تعصب کی
دھرتی کے ہر باسی کو دل کا مہمان بنانا ہے

ہر دل کو باہر لانا ہے بے چینی کی دلدل سے
ہر چہرے کے واسطے ہم کو اطمینان بنانا ہے

کھل کر سامنے آ جائیں اندر باہر کے سب دشمن
ایسی کھڑکی کھولنی ہے ایسا امکان بنانا ہے

اپنا ہر اک شعر اور مصرع حب وطن میں ڈوبا ہو
نظمیں غزلیں دو ہے کہہ کر اک دیوان بنانا ہے

ثمینہ سیّد

لمبی جدائیاں ہوں مگر انسیت رہے
"ایسے الگ ہوں دونوں طرف خیریت رہے"

سمجھو مجھے کنیز مگر شرط ہے مری
یونہی تمھارے دل میں مری حیثیت رہے

تعلیم کا حصول اداروں سے ہو مگر
ماں باپ کی طرف سے بھلی تربیت رہے

جو بھی ہوں اقتدار میں ان سے یہ عرض ہے
امن و اماں ہو چاروں طرف عافیت رہے

سب کچھ میں بھول جاؤں مجھے یاد کچھ نہ ہو
لیکن تمھارے عشق کی قائم یہ لت رہے

غزل

کبھی جو تم بھی ہمیں بے سبب دعا دیتے
ہمیں یقین ہے ہم بھی تمہیں بھلا دیتے

سنے بغیر ہی تم چل دیے خفا ہو کر
جو مانگ لیتے تو ہم جان بھی لٹا دیتے

تم اپنی بات پہ قائم نہیں رہے تو کیا
ہم ایسے لوگ ہیں کیسے بھلا دغا دیتے

یہ اور بات کہ وہ لوٹ کر نہیں آیا
ہم اپنے در پہ چراغوں کو تو جلا دیتے

اسی لیے تو کبھی کچھ نہیں لکھا تم کو
ہمارے خط تمہیں شاید بہت رلا دیتے

ہزار بار سنا، دل نے ماننے نہ دیا
وگرنہ شہر کے دیوار و در ہلا دیتے

ہم اہلِ درد، مگر ضبط کے بھی پیکر ہیں
اگر وہ پوچھتے جبران ہم بتا دیتے

وسیم جبران

غزل

ٹوٹتے سہارے پر زندگی گنوانا کیا
کہہ کے جو مکر جائے اس کو آزمانا کیا

دل میں زہر کیوں گھولوں چھپ کے ہی نہ کیوں رولوں
اپنے اشک پی پی کر آنکھ کا جلانا کیا

زندگی ہماری جب بلبلے کی صورت ہے
پھر ہوس کا یہ ایواں یہ محل بنانا کیا

اعتبار کیا پھر بھی اپنا عہد تازہ کر
جانتا ہوں میں تجھ کو کرنا ہے بہانا کیا

اپنا دل جلا محسن کالی رات کٹ جائے
بے اماں اندھیرے کو اک دیا دکھانا کیا

میتھیو محسن

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

زندگی میں کسی زخم کا، کسی دُکھ کا ہونا
اچھا ہوتا ہے سفر میں کوئی اپنا ہونا

غزل

یوں ہی پھیلی تو نہیں شہر میں ساری باتیں
سنتا رہتا ہے کوئی چھپ کے ہماری باتیں

رنگ و خوشبو سے مزین نہ ہوں کیسے راہیں
جسم مانندِ چمن ، بادِ بہاری باتیں

جتنے الجھاؤ ہیں ڈھلنے لگے زیبائی میں
میٹھے لہجے نے ہیں اس طرح سنواری باتیں

آپ انہونیاں کرتے ہوئے کب سوچتے ہیں
ایسے لوگوں کو سناتے ہیں مداری باتیں

دیکھنا دوست تمہیں چھوڑ کے جا سکتے ہیں
جب انہیں لگنے لگیں گریہ و زاری باتیں

کر دیے جاتے ہیں یک جان بدن بھی دولخت
کاٹ سے لوگ بنا دیتے ہیں آری باتیں

جس طرح پھول سے خوشبو کی ہے نسبت جاذب
پیارے لوگوں سے ہی منسوب ہیں پیاری باتیں

اکرم جاذب

غزل

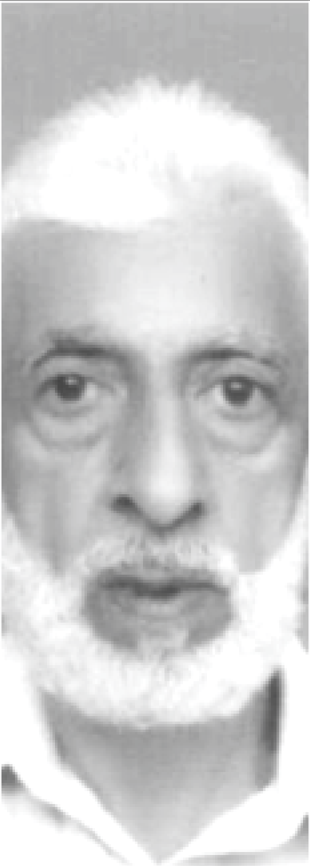

ہمایوں پرویز شاہد

وفا کی راہ میں سر کو کٹا لیتے تو اچھا تھا
کیے تھے ہم نے جو وعدے نبھا لیتے تو اچھا تھا

یہی ہوتا کہ رہتی جاں ہمیشہ ہی ہتھیلی پر
مگر تم آئنہ خود کو بنا لیتے تو اچھا تھا

قدم سے میل میلوں سے جو صدیوں کا بنے رستہ
اگر وہ فاصلے یارو مٹا لیتے تو اچھا تھا

یقیناً چور ہو جاتا تکبر ظلمتِ شب کا
دیا حصے کا سب اپنے جلا لیتے تو اچھا تھا

جنھوں نے کر دیے تقسیم ٹکڑوں میں سبھی رشتے
ہوس کی ہم وہ دیواریں گرا لیتے تو اچھا تھا

بنے ہیں روگ دل کا جو بھلا کر اپنے وعدے کو
وہ ساون میں غریبوں کی دُعا لیتے تو اچھا تھا

جو دل پر بوجھ ہے شاہد یقیناً وہ نہیں ہٹتا
کسی کے درد کو اپنا بنا لیتے تو اچھا تھا

غزل

مجھے غیروں سے شکوہ کیا اگر وہ بے وفا نکلے
جو میرے ہم نوا تھے اصل میں کب ہم نوا نکلے

کِیا تھا سب نے ہی اقرار تیرے ایک ہونے کا
مگر اس شہرِ آذر میں تو کتنے ہی خدا نکلے

مری بربادیوں کا ذکر جب چھیڑا زمانے نے
کہانی میں جو نام آئے وہ سارے آشنا نکلے

کوئی صورت تو نکلے اب بلندی پر پہنچنے کی
کہیں سے تو زمیں کا آسماں سے رابطہ نکلے

وہ یوں نخوت سے نکلا ہے سیہ ملبوس میں گھر سے
ہوا کے دوش پر جیسے کوئی کالی گھٹا نکلے

بھلا کیا بے بسی کی بے بصر آنکھوں پہ اتراؤں
جدھر دیکھوں اُدھر پابندیوں کا دائرہ نکلے

مرے حق میں سنا جب فیصلہ میرے حریفوں نے
وہ بھاگے اس طرح جیسے غبارے سے ہوا نکلے

مسائل سارے عالم کے فقط اک پل میں حل ہوں گے
ذرا اُلجھے ہوئے دھاگے کا کوئی تو سرا نکلے

جدھر دیکھوں ہیں تا حدِ نظر پھیلے ہوئے صحرا
کسی سرسبز وادی کا کہیں سے راستہ نکلے

چلو چلتے ہیں لوگو! رحمتِ عالم کی چوکھٹ پر
کہ اپنی رُستگاری کا کوئی تو راستہ نکلے

کوئی منظر نہ ہو جب روبرو بے خواب آنکھوں کے
کوئی کیا زائچہ کھینچے کوئی تعبیر کیا نکلے

سرور فرحان

غزل

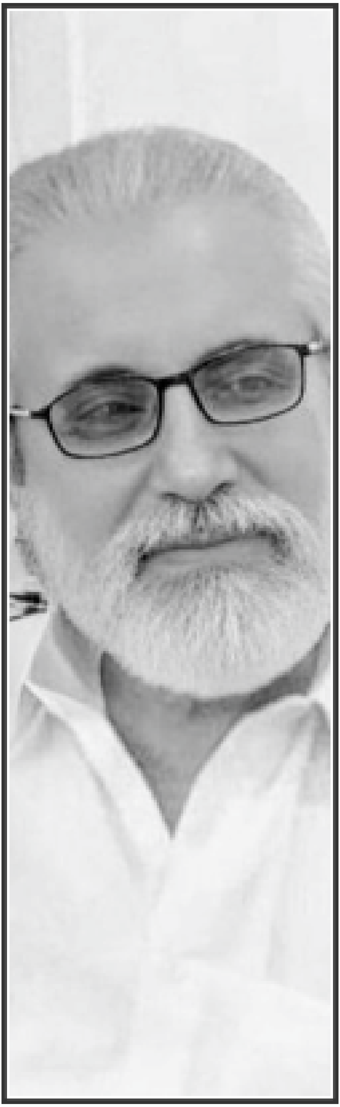

اس طرح زیست گزری تمہارے بغیر
جیسے دریا کوئی ہو کنارے بغیر

اور اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا
بات بنتی نہیں تھی اشارے بغیر

عشق کی داستاں نامکمل رہی
کچھ تمہارے بنا کچھ ہمارے بغیر

وہ جو رہتا نہیں تھا بنا روپ کے
اب وہ رہتا ہے خود کو سنوارے بغیر

چاند دیکھے بنا نیند آئی نہیں
خواب پورا ہوا کب ستارے بغیر

تم زیاں کی حقیقت کو سمجھو گے کیا
تم تو شاداں رہے ہو خسارے بغیر

پیڑوں سے دشمنی تھی سبھی کو یہاں
کوئی دیکھا نہیں ہم نے آرے بغیر

تھے کراچی میں روزی کے مارے ہوئے
زیست افضل گزاری ہزارے بغیر

افضل ہزاروی

غزل

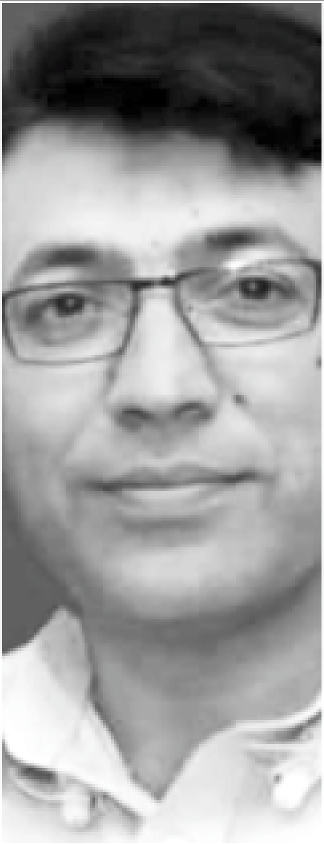

صبح کا روپ لیے شام کنارا ہوا شخص
ایسا ہوتا ہے محبت پہ اتارا ہوا شخص

مسخ ایسا ہوا پہچان میں آتا ہی نہیں
وقت کی طرح شب وروز گذارا ہوا شخص

آگے بڑھنے کی سکت لائے تو لائے کیسے
ہر قدم پر تری آہٹ کا پکارا ہوا شخص

پتلیوں پر مری آنکھوں کی چمکتا ہے ہنوز
وہ کسی اور کی قسمت کا ستارا ہوا شخص

جی اٹھا لمس سے پھر دست اجل کے عابد
ہائے دھتکارا ہوا زیست کا مارا ہوا شخص

عابد خان عابد

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کس نے مہر کرم چمکایا
جگ جگ دھو کا ہُن برسایا

غزل

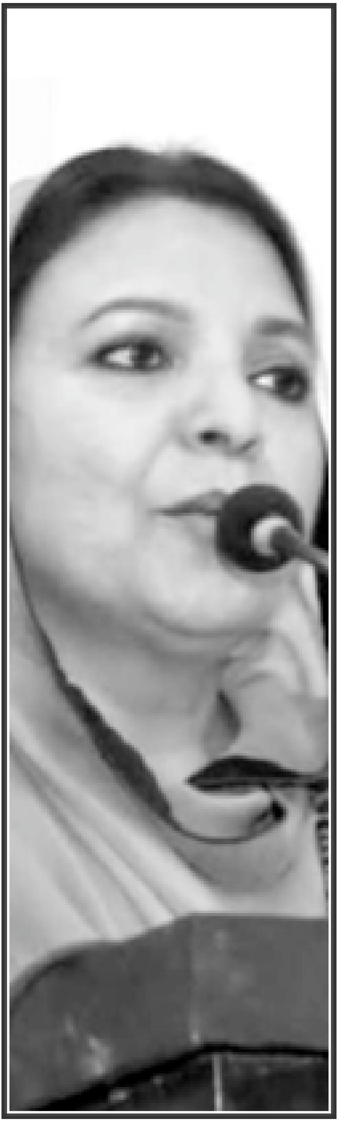

خالدہ انور

اشک چھلکا تو روکنا کیسا
جب گئے جاں سے سوچنا کیسا

کر کے وعدے کو توڑنا کیسا
چل پڑے ہیں تو ڈولنا کیسا

وہ جو اک خدشہ مسلسل تھا
اس کے ہونے پہ چونکنا کیسا

وقت کے ساتھ بہہ گیا ہے کہیں
گمشدہ پل کو کھوجنا کیسا

راہ کتنی کٹھن ہو ، ساتھ ہیں ہم
کہہ دیا ہے تو لوٹنا کیسا

جب نہیں آرزو کنارے کی
بادبانوں کا کھولنا کیسا

ایک ہی آستاں کے پتھر سے
بارہا سر کو پھوڑنا کیسا

بات کرنے سے پہلے تولتے ہیں
بات کے بعد تولنا کیسا

غزل

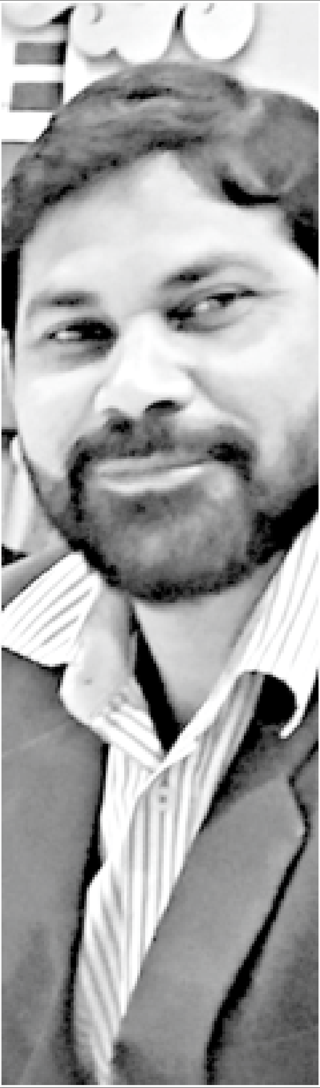

ندائے ضبط کی ساری کسر نکالتے ہیں
سخن کے پیڑ بھی برگ و ثمر نکالتے ہیں

خیال ایسے اُبھرتے ہیں کاسۂ سر میں
کہ سانپ جیسے زمینوں سے سر نکالتے ہیں

وہ شہرِ دل سے مجھے کر رہے ہیں شہر بدر
میں لوٹ آؤں تو بارِ دگر نکالتے ہیں

کہاں ملیں گے زمانے میں روشنی کے نقیب
جو اپنی آنکھ سے شمس و قمر نکالتے ہیں

وہ اپنی ذات میں محبوس ہو کے بیٹھے ہیں
ہم اپنی ذات کے محبس سے در نکالتے ہیں

جب اپنے سارے اثاثے جلا کے بیٹھ گئے
پھر اُس کی راکھ سے شعلہ شرر نکالتے ہیں

تم اپنی چرب زبانی سے کچھ کمال کرو
ہم اپنی جیب سے اپنا ہنر نکالتے ہیں

بہار ایسا کرشمہ ہے عابدی جس میں
پرندہائے زمانہ بھی پر نکالتے ہیں

علی حسین عابدی

غزل

دل میں کئی ارمان جگا دیتی ہے بارش
احساس کو رنگوں سے سجا دیتی ہے بارش

بھیگی سی سڑک اور اداسی کی فضا تھی
کیا کیا نہ مجھے یاد دلا دیتی ہے بارش

کیوں مجھ کو بلاتا ہے ترے شہر کا موسم
پھر جال اداسی کا بچھا دیتی ہے بارش

لوٹائے نہیں جاتے کبھی یاد کے موسم
جب چاہے وہی رنگ جما دیتی ہے بارش

یہ کیسا نشہ اس کی چھما چھم میں چھپا ہے
سویا ہوا اک خواب جگا دیتی ہے بارش

بکھرے ہیں کئی خواب سمیٹے نہیں جاتے
کیوں کچے مکانوں کو گرا دیتی ہے بارش

نائلہ راٹھور

یہ لوگ تو آنسو بھی بہانے نہیں دیتے
نیکی کو بھی دریاؤں تک آنے نہیں دیتے

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

غزل

ایک بھی اشک ترے واسطے ٹپکا بھی نہیں
کوئی پیاسا ہے ترا خیر سے اتنا بھی نہیں

تیری قسمت ہے بھلی دشت میسر ہے تجھے
دشت کیسا مرے حصے میں تو دریا میں نہیں

کون آیا ہے مجھے اپنے سوا یوں بھی پسند
اور پسند اس کو کوئی میرے علاوہ بھی نہیں

تو نے سوچا تھا کہ چھپ جائے گا دنیا بھر سے
خون اتنا مرے سردار کا سستا بھی نہیں

اتنی یکسوئی مقدر سے ہی ملتی ہے میاں
سو گیا خواب میں کوئی، کوئی جاگا بھی نہیں

میرے شاہوں نے لیا بدلہ بھی ایسے ہے کہ بس
سرِ صحرا کوئی معصوم کہ پیاسا بھی نہیں

یار لوگوں سے ہے وہ پوچھتا رہتا میرا
یہ الگ بات اسے مجھ سے علاقہ بھی نہیں

رستے مسدود نہ کر، رستے کھلے کر دنیا
ماتی شہ کا گلی سے تری گزرا بھی نہیں

اس لیے بھی میں گریزاں ہوں ترے ملنے سے
اب مرا نام نہیں، کوئی حوالہ بھی نہیں

کارگر ہو نہیں پائی کوئی تکنیک، قمر
دیکھنے میں تو مرا زخم ہے گہرا بھی نہیں

قمر نیاز

غزل

عجب خلا ہے کوئی یار و غم گسار نہیں
جہاں اُترنا تھا میں نے یہ وہ مدار نہیں

دلِ فقیر کو سرشار کر دیا تُو نے
تری عطا کا کسی طور بھی شُمار نہیں

ہزار کیا یہاں لاکھوں ترا شکار ہوئے
اسیرِ حُسن فقط ایک خاکسار نہیں

کروڑوں سال پہ پھیلے ہوئے زمانوں میں
سوائے سانس مرا کوئی اختیار نہیں

یہ کاروبارِ جنوں ہے سنبھل کے چلیے گا
دیارِ عشق میں رتی کا بھی اُدھار نہیں

بہت سے عیب چھپائے ہوئے ہیں مستحسن
سبھی کے سامنے گُدڑی مری اُتار نہیں

مستحسن جامی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کس کو چُھو کر ماہتابی ہو گیا
جھیل کا پانی شہابی ہو گیا

غزل

صدا تھی مگر بے صداؤں میں تھے
خبر کیا کہ ہم کن فضاؤں میں تھے

ہمی ہم تھے سارے جہاں پر محیط
فضا میں، فلک میں، گھٹاؤں میں تھے

سمندر کی طغیانیوں نے کہا
خدا بن کے ہم ناخداؤں میں تھے

تمھیں کیا خبر اے مریضِ الم
شفا بن کے ہم ہی دواؤں میں تھے

خبر ہی نہیں اِس جہاں کو کہ ہم
محبت کی رنگیں دعاؤں میں تھے

طلب میری آساں نہیں تھی مگر
حسینوں کی ہم التجاؤں میں تھے

اندھیروں میں وہ راہزن بن گئے
وہی لوگ جو رہنماؤں میں تھے

ہمیں کیا تبدّل کا احساس ہو
کہ اِک عمر ہم دھوپ چھاؤں میں تھے

زمانہ تھا اپنی فضا میں ندیم
"مگر ہم بھی اپنی ہواؤں میں تھے"

ریاض ندیم نیازی

غزل

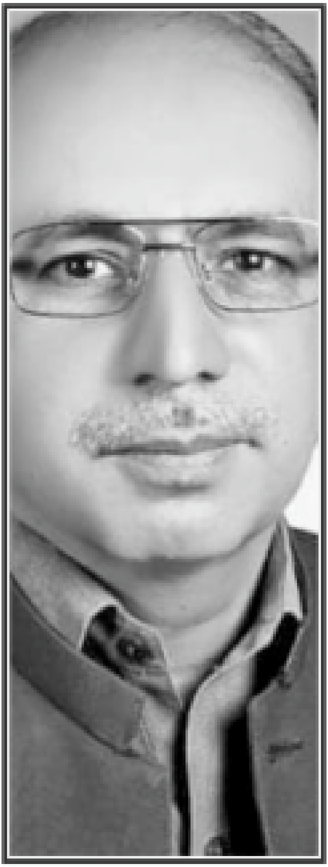

بستگیِ غم پناہوں کی تقسیم ہے
بے دلی کم نگاہوں کی تقسیم ہے

یہ دھواں آتشِ ناچشیدہ کی چھب
یہ دھواں سرد آہوں کی تقسیم ہے

اس جگہ مطربہ! گیت گایا نہ کر
اس جگہ بادشاہوں کی تقسیم ہے

جسم سازی عنایاتِ کوزہ گراں
خستگی گرم بانہوں کی تقسیم ہے

جستجو اک تنی سی رگِ زرد ہے
فاصلہ سبز گاہوں کی تقسیم ہے

تیرے میرے مقدر میں عادل نہیں
یہ زمیں عالی جاہوں کی تقسیم ہے

عزیز عادل

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

مجھ سے طلوعِ صبح کے منظر چھپا گئی
ٹھنڈی ہوا چلی تو مجھے نیند آ گئی

غزل

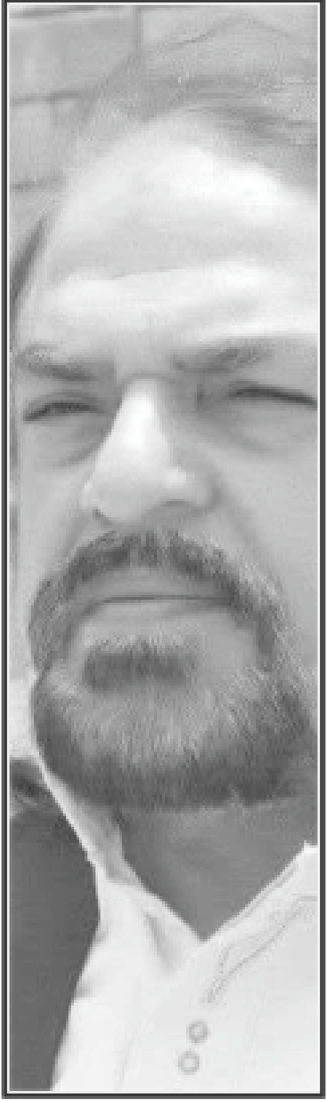

طاقِ دل پر تری تصویر جلا رکھتے ہیں
اس طرح ہم سخن آرائی بپا رکھتے ہیں

خاک و ناخاک کے چکر میں پڑے رہتے ہیں
روح رکھتے ہیں الگ جسم جدا رکھتے ہیں

جانے کب لوٹ کے آ جائے بدن کا سایہ
دھوپ کی اور میں دروازہ کھلا رکھتے ہیں

کوئی مانے کہ نہ مانے ہمیں انکار نہیں
ہم عقیدوں کی منڈیروں پہ خدا رکھتے ہیں

ٹوٹ جائیں گی کسی روز طنابیں اس کی
خیمۂ دل میں تمنائیں سجا رکھتے ہیں

لوٹ جائے نہ کہیں دیکھ کے وہ تیرہ شبی
ایک قندیل سی کھڑکی میں جلا رکھتے ہیں

احمد ساقی

غزلیں

قصہ سمیٹنا تھا مگر پھیلتا گیا
منظر ورائے حدِ نظر پھیلتا گیا

گرہیں بدن کی گٹھڑی میں لگتی رہیں مگر
ہر مستقر پہ زاوِ سفر پھیلتا گیا

تعبیر کوئی بھی نہ کنارے کو پا سکی
اک خواب تھا جو بن کے بھنور پھیلتا گیا

کام آ گئی مکاں میں سمٹی ہوئی لچک
بسنے لگے مکین تو گھر پھیلتا گیا

اک عمر خود فریبی نے روکے رکھا اسے
پھر زہرِ آگہی کا اثر پھیلتا گیا

محصور کر رہی تھی اسے دھوپ دشت کی
شاخیں بنا کے ڈھال شجر پھیلتا گیا

جب ایڑیوں پہ گھومنے والا تھا آفتاب
چاروں طرف سرابِ سحر پھیلتا گیا

افتخار الحق

آئینہ بن کے عکس میں ترمیم کیا کریں
اپنے لکھے کلام کی تفہیم کیا کریں

رشتوں کو دفن کرتے ہی آنے لگی صدا
دل کے اثاثہ جات کی تقسیم کیا کریں

الفاظ پوچھتے ہیں یہ نسیاں میں جھانک کر
اس شہرِ بے خیال کی تجسیم کیا کریں

تھک کر گرا ہے سرحدِ تعبیر کے ادھر
ایسے ضعیف خواب کی تعظیم کیا کریں

اپنا وجود ماضی سے کرتا نہیں جدا
اے حال کالعدم تری تقویم کیا کریں

جس کو کیے بغیر سزا پا چکے ہیں ہم
ایسے انوکھے جرم کو تسلیم کیا کریں

جب وصل کے صحیفے کی تفسیر پڑھ چکے
یکجائی کی اکائی کو دو نیم کیا کریں

غزل

آج ہم ہیں دیار میں اپنے
سب کھڑے ہیں قطار میں اپنے

میری باتوں کا مت برا مانو
میں نہیں اختیار میں اپنے

موت یوں ہی مجھے نہیں آئی
میں مرا اعتبار میں اپنے

مجھ کو چاہت ہے خود سے ملنے کی
میں بھی ہوں انتظار میں اپنے

یہ تعلق یونہی نہیں ٹوٹا
وہ نہیں ہے شمار میں اپنے

ہم ہی جانے ہدف ہیں کیوں سب کا
پھر رہے ہیں شکار میں ، اپنے

بدگمانی کا ہے دھواں ہر سو
گھر گیا ہوں غبار میں اپنے

ہم کو درکار ہے پذیرائی
کوئی لے لے حصار میں اپنے

ہم کو پت جھڑ سے کیا گلہ انجم
کھو گئے سب بہار میں اپنے

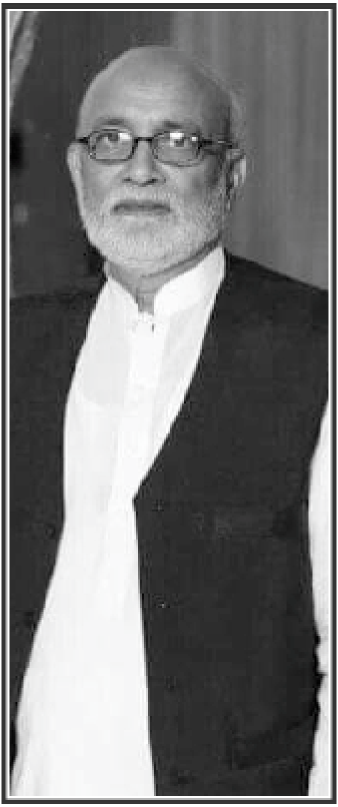

محمد افضال انجم

غزل

تمام چہرہ ڈھکا ہوا ہے اِدھر اُدھر سے
مگر وہ مرکز بنا ہوا ہے اِدھر اُدھر سے

تمھیں لگے گا یہ سچ ہے لیکن یہ سچ نہیں ہے
کہ تم نے قصہ سنا ہوا ہے اِدھر اُدھر سے

اِدھر، اُدھر کی ہر ایک شے سے جو باخبر ہیں
میاں! کوئی تو مِلا ہوا ہے اِدھر، اُدھر سے

تمھیں تو دیوار کھینچنی تھی سو کھینچ دی تھی
مگر شجر وہ اُگا ہوا ہے اِدھر اُدھر سے

تمھاری باتوں سے لگ رہا ہے نئے نہیں ہو
سبق یہ تم نے پڑھا ہوا ہے اِدھر اُدھر سے

نہیں نہیں یار تم سے کوئی گِلہ نہیں ہے
ہمارا دل تو دکھا ہوا ہے اِدھر اُدھر سے

کوئی بھی نازش! نہیں ہے آزاد اس جہاں میں
جسے بھی دیکھو بندھا ہوا ہے اِدھر اُدھر سے

شبیر نازش

غزل

وقت مرا لگ جاتا ہے غم خواری میں
غم ترتیب سے رکھے ہیں الماری میں

کاجل سرخی غازہ کنگھی شیشہ دھیان
ہاتھ بٹاتا تھا وہ بھی تیاری میں

دیپک راگ بھی اچھا تھا اُس کا لیکن
راگ بہت ہی پکا تھا درباری میں

میرا شوق تو دنیاداری ہوتا تھا
وہ مشغول ہی رہتا تھا دلداری میں

سارے رنگ ہی اُس کے مہیا کردہ تھے
میں تو بس بھرتی تھی انھیں پھلکاری میں

یوں تو اسیر تھا میری گھنی زلفوں کا وہ
اُف، جب بھی، بال آجاتا ترکاری میں

ہم دونوں میں اچھی خاصی دوستی تھی
پڑ گئے عشق کی پھر موذی بیماری میں

سچ ہے حال میں بھی بے حال ہی رکھتا ہے
عشق رہا جو ماضی استمراری میں

دل کا شیشہ اور سبب دھندلایا تھا
نقص نکالے دونوں نے زنگاری میں

اِس موسم میں رونا ٹھیک نہیں ہوتا
کانٹے اُگ آتے ہیں دل کی کیاری میں

نیم کے پتوں کے نیچے یادیں رکھ کر
چل الماس تُو اب لگ جا گھرداری میں

الماس شبی

غزل

ہم جھکی نظروں سے مت پوچھیے کیا دیکھتے ہیں
روز ہی ایک نئی کرب و بلا دیکھتے ہیں

اپنی بستی کے چراغوں کو بجھا دینے کے بعد
کس طرف جاتی ہے ناراض ہوا، دیکھتے ہیں

صبح دم بھی نہیں جب چھٹتے اندھیرے اپنے
کون لے جاتا ہے سورج کی ضیا، دیکھتے ہیں

باغباں حوصلہ! ہم لوگ نہیں ہیں گل چیں
ہم تو بس قافلۂ بادِ صبا دیکھتے ہیں

اپنے صحراؤں میں وہ تشنہ لبی ہے کہ نہ پوچھ
آتی جاتی ہوئی ہر ایک گھٹا دیکھتے ہیں

کچھ نہیں کھلتا کہ ماحول میں نوحے کیا ہیں
جس طرف سے کوئی آتی ہے صدا، دیکھتے ہیں

سوچتے ہیں کہ یہ خوش رنگ لہو اپنا ہے؟
خوں سے لتھڑے ہوئے جب بندِ قبا دیکھتے ہیں

اور کچھ لوگ ہیں خیمے میں ہمارے وہ بھی
کب بجھائے کوئی خیمے کا دیا، دیکھتے ہیں

کور چشموں کو بھی سورج سے ہے امید کرم
تیرگی بڑھتی ہے تو سوئے حرا دیکھتے ہیں

کچھ تو ہے جو نہیں ہم سوں کو دکھائی دیتا
کچھ تو ہے دور سے جو آبلہ پا دیکھتے ہیں

ہم اسی آس پہ قبروں سے نکل آئے ہیں
کیا سزا دیتا ہے ظالم کو خدا، دیکھتے ہیں؟

در پہ آئی ہوئی تقدیر کی دستک بے سود
ہم کبھی ہاتھ، کبھی رنگِ حنا دیکھتے ہیں

اپنا انجام یہی ہے تو گریزاں کیوں ہیں؟
آؤ مقتل کی ذرا آب و ہوا دیکھتے ہیں

کوئی بھی دارِ بقا باقی نہیں اپنے لیے
سو علمدار کوئی دارِ فنا دیکھتے ہیں

علمدار حسین

غزل

اس دل کے ستانے کو یہ پیغام بہت ہے
میدان میں ہر سمت ابھی کام بہت ہے

مدت ہوئی اشکوں سے بھگویا نہیں دامن
آنکھوں پہ مگر یاس کا الزام بہت ہے

قرطاسِ لہو رنگ پہ تصویرِ جواں مرگ
خاموش ہوئی جنگ کے ہنگام بہت ہے

پھولوں کی زمیں آج کسی شے میں نہیں کم
بارود دھواں آگ ہر اک گام بہت ہے

وہ تشنہ لبی ہے کہ سمندر کرے ماتم
صحرا میں بھڑکتا ہوا کہرام بہت ہے

اس ہاتھ میں شمشیر تو اس ہاتھ علم ہو
بچپن کا ہے اک خواب کہ اب عام بہت ہے

"ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات"
یہ ارضِ فلسطین پہ الزام بہت ہے

صد شکر کہ بے چین پریشاں نہیں یہ دل
"گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے"

وہ وقت بھی ہے یاد پشاور کی فضا میں
اک پھول چہکتا تھا کہ گل فام بہت ہے

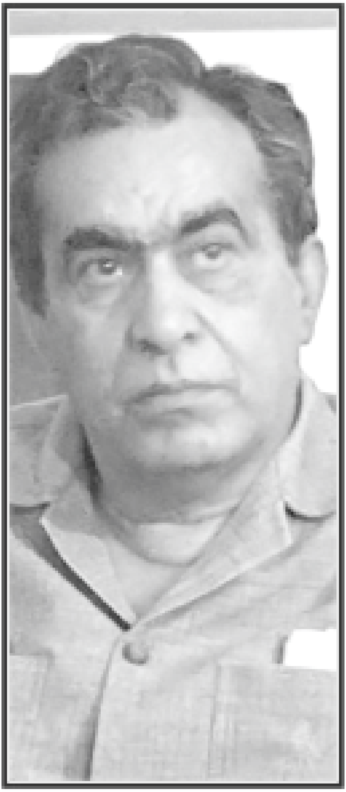

اورنگزیب حسام حر

غزل

گلے خود سے کیے ہیں گفتگو بھی
کیا ہے آج آنکھوں نے وضو بھی

خدا رکھے اسے ہر دم سلامت
جو میرا یار ہے، میرا عدو بھی

ہے پتھر مارنے والوں میں شامل
اے میرے سب سے اچھے یارا تو بھی

اسے، جو بات تھی دل کی، بتا کر
گنوا بیٹھے انا بھی، آبرو بھی

صغیر اس کا سراپا لکھ نہ پایا
بڑا شاعر بنا پھرتا ہے تو بھی

صغیر احمد صغیر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اندھیر رہ نہیں سکتا سدا خدائی میں
خدا گواہ بنے گا مری صفائی میں

غزل

عشق سے جب مکالمہ ہو گا
رب ہی جانے کہ میرا کیا ہو گا

تو نہ ہو گا تو ہو گی تنہائی
ساتھ میرے مرا خدا ہو گا

جس طرف دیکھتا ہے وہ اکثر
اس طرف کوئی تو گیا ہو گا

مل رہا ہے وہ جس تکلف سے
اب ارادہ کوئی نیا ہو گا

منزلیں بعد میں ہوئیں ایجاد
پہلے کچھ راستہ بنا ہو گا

اس کی آنکھوں میں خون اُترا ہے
حادثہ کوئی تو ہوا ہو گا

پہلے دو دل جدا ہوئے ہوں گے
ایسے دریا نہیں بنا ہو گا

سانس لینے میں ہو گی دشواری
یوں دھواں شہر میں بھرا ہو گا

جانے والے کو تھی بہت جلدی
کچھ تو کہنے سے رہ گیا ہو گا

مسخرہ پن ہی لوگ سمجھیں گے
دکھ سنانے سے بڑھ گیا ہو گا

آخری سانس پر ہے اب تاریخ
جھوٹ کا سب کیا دھرا ہو گا

اتنا خاموش تو نہ تھا امجد
خامشی نے اسے ڈسا ہو گا

امجد خان تجوانہ

غزل

گذرے بُری یا بھلی بہت ہے
کچھ دن کی ہی زندگی بہت ہے

کہتے ہیں اندھیرے اُس مکاں کے
اب بھی وہاں روشنی بہت ہے

اک عمر کے بعد جو ملی ہو
چھوٹی سی بھی وہ خوشی بہت ہے

محسوس کیا ہے تو کہا ہے
تیری یہاں پر کمی بہت ہے

چہروں کو پرکھنے لگ گیا ہوں
اب اتنی ہی آگہی بہت ہے

توفیقِ سخن ظہورؔ ہم کو
رب کا ہے کرم، ملی بہت ہے

ظہور چوہان

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

یہ سفر، مگر بہ مگر رایگاں بھی نہیں
کارِ دل محض کارِ زیاں بھی نہیں

غزلیں

پوری آنکھوں سے اس نے جب دیکھا
میں نے دنیا کو جیسے اب دیکھا

دل پہ جیسے بہار آنے لگی
ایسے عالم میں دل کو کب دیکھا

چشمِ دل وا ہوئی ترے دم سے
تم نے جب چاہا میں نے تب دیکھا

ایک دنیا بس ایک جیسی تھی
ایک دنیا کو بے سبب دیکھا

اک عجب سا خمار چھایا تھا
تم کو دیکھا یا چاند شب دیکھا

کوئی تدبیر پھر نہ کام آئی
جو بھی قسمت میں تھا وہ سب دیکھا

راجہ عبدالقیوم

مجھ سے باتیں کرتا ہے آوازیں دیتا سناٹا
ٹھنڈی آہیں بھرتا ہے آوازیں دیتا سناٹا

گھر چپ ہوں تو ان میں آ کر کتنا شور مچاتا ہے
چپ رہنے سے ڈرتا ہے، آوازیں دیتا سناٹا

گھر کو کبھی نہ خالی رکھنا رنگ برنگی خوشبوؤں سے
خالی گھر کو بھرتا ہے، آوازیں دیتا سناٹا

اس کو گھر میں آنے دیا تو گھر بھر پہ چھا جائے
پھر دیکھو کیا کرتا ہے، آوازیں دیتا سناٹا

سناٹے میں رہنے والے اس میں گم ہو جاتے ہیں
یہ جیتا نہ مرتا ہے، آوازیں دیتا سناٹا

غزل

محمد اشفاق بیگ

دل میں تیرا خیال ہو جیسے
ایک الجھا سوال ہو جیسے

بن ترے وقت یوں گزرتا ہے
ایک پل ایک سال ہو جیسے

سرد شاموں میں میرے شانوں پر
تیری یادوں کی شال ہو جیسے

اب تو جینا بھی جرم لگتا ہے
زیست کرنا محال ہو جیسے

سوگ میں ہے چمن کا ہر اک پھول
ہر کلی پر ملال ہو جیسے

اب نہ بولے ہے باغ میں بلبل
موسموں پر زوال ہو جیسے

تیری فرقت ہے قربتوں جیسی
ہجر تیرا وصال ہو جیسے

تیری چاہت بھی خوب ہے اشفاق
اس کا عکسِ جمال ہو جیسے

غزلیں

صفحہ پلٹیں گے تو کردار بدل جائے گا
یہ بھی قصہ ہے، مرے یار! بدل جائے گا

تلخ لہجوں کو بدل دیتا ہے وہ شیریں سخن
جب وہ آئے گا تو اظہار بدل جائے گا

اس کہانی میں کئی موڑ ابھی آنا ہیں
ایک فرمانِ سرِدار بدل جائے گا

ہم بھی ہر بار اِسی در پہ چلے آتے ہیں
جیسے ان کا کہا اس بار بدل جائے گا

ہو گا مقبول کسی روز کہا میرا بھی
اور یہ وقت کا معیار بدل جائے گا

راستا کوئی رہے گا نہ مسافر احمد
یہ جو موجود ہے، یک بار بدل جائے گا

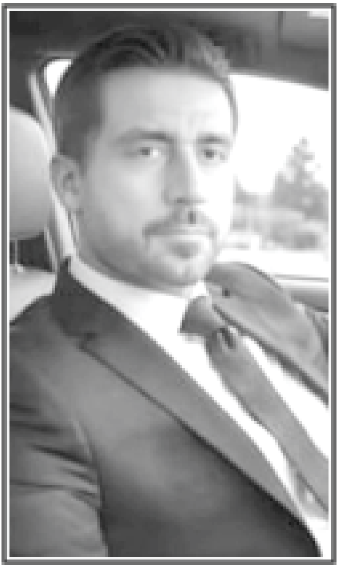

بشیر احمد حبیب

ابھی نظروں سے اوجھل ہیں، ابھی وہ سامنے بھی ہیں
وہ مجھ سے دور ہیں لیکن بباطن رابطے بھی ہیں

ستاروں کے مکینوں سے ملن دشوار ہے، لیکن
بہت دن سے یہ سنتا ہوں: وہاں تک راستے بھی ہیں

ادھوری بات چھوڑی ہے کہ ملنے کا بہانہ ہے
جو دل میں ہے، وہ کہہ دیتے مگر کچھ سوچتے بھی ہیں

دورنگی سی جھلکتی ہے اگر وہ کچھ بھی کہتے ہیں
کبھی کہہ دیتے ہیں: جاؤ، کبھی خود روکتے بھی ہیں

سکوں کی نیند سے بھی اب تو وحشت کم نہیں ہوتی
ہمارے خواب میں گویا کسی کے رتجگے بھی ہیں

جدائی میں خبر ہے کس قدر دشواریاں ہوں گی
تجھے جاتا ہوا کس شوق سے ہم دیکھتے بھی ہیں

سمجھ لو تم بشیر احمد! انھیں تم سے محبت ہے
گلے ہنس کر لگاتے ہیں اگرچہ ڈانٹتے بھی ہیں

غزل

دنگے اور فساد کرائے مٹھو نے
اپنے دیس کے لوگ لڑائے مٹھو نے

شاہی ٹکڑے ڈال کے لنگر خانے سے
سوچ پہ پہرے دار بٹھائے مٹھو نے

روٹی پانی سانس دوا سب چیزوں پر
دیکھو کیا کیا ٹیکس لگائے مٹھو نے

ٹیکس لگائے فصل اُگانے والوں پر
اپنے کاروبار بچائے مٹھو نے

آئی ایم ایف یو این او جیسے لوگوں سے
ذاتی قول قرار نبھائے مٹھو نے

بدکردار کے کچے لکھنے والوں کے
خون سے یہ بازار سجائے مٹھو نے

ہم کو ہر اُس بات پہ رونا آتا ہے
جس پر پنجے دانت دکھائے مٹھو نے

میرے مولا تیری بے بس دنیا میں
ہم جیسے درویش ستائے مٹھو نے

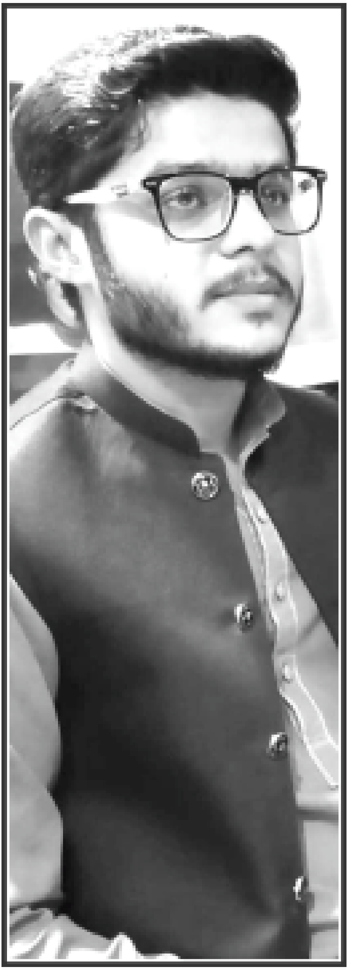

طلحہ غفور

غزل

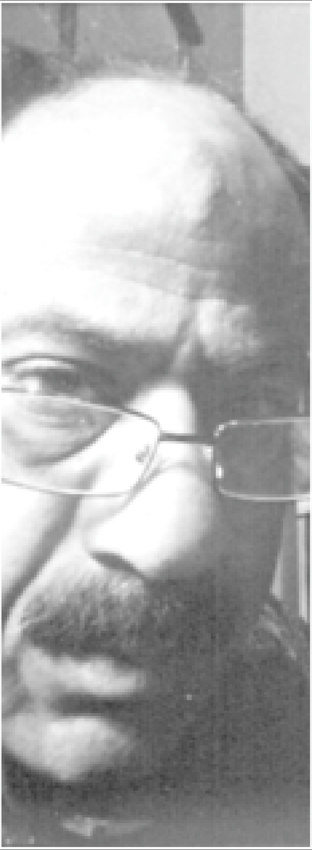

چند غزلیں خطوط نکلے ہیں
بس ہمارے یہی اثاثے ہیں

تیز چلتی ہیں جب ہوائیں تو
پیڑ بھی تالیاں بجاتے ہیں

بن گئی ہے جو ٹیم چوروں کی
دیکھیے کیا یہ گل کھلاتے ہیں

تیری خاطر ہی گنگناتا ہوں
گیت تیرے لیے ہی لکھے ہیں

مان کر بھی وہ ہم سے ہیں برہم
نت نئے رات دن تماشے ہیں

دکھ سے شاید وہ آشنا ہی نہیں
جو ہمیشہ ہی مسکراتے ہیں

آج کچھ تو ہوا ہے قیصر جو
شام سے منہ بنائے بیٹھے ہیں

نبیل قیصر

انتخاب

— خالد احمد —

نعمان منظور

زلفیں کھول کے رنجوری کی
کس کے دکھوں کی مشہوری کی

غزل

کسی کا منتظر ہر شب دلِ بے تاب رہتا ہے
نہ جانے کس جہاں میں اب مرا مہتاب رہتا ہے

جو لمحے بیت جاتے ہیں، وہی ہنگامہ کرتے ہیں
یہاں ہر پل میں ماضی کا کوئی گرداب رہتا ہے

دلوں کے بیچ میں دیوار جو تم نے اُٹھا دی ہے
تبھی یاروں کا دروازہ بھی اب نایاب رہتا ہے

ہجومِ یاس مجھ کو ہر گھڑی گھیرے نہ کیوں ہمدم
وہ چہرہ پاس ہو کر بھی پسِ احباب رہتا ہے

ہمیں تو خاک میں بھی روشنی محسوس ہوتی ہے
سبب یہ ہے کہ ان گلیوں میں اک مہتاب رہتا ہے

سفر کتنا نہیں ہے چاندنی شب میں یہاں تنہا
کہ اس منظر کے پیچھے اک سہانا خواب رہتا ہے

مرے کمرے میں اب مہتاب بھی اُترے تو لگتا ہے
کہ جیسے درد کی دیوار پر اک خواب رہتا ہے

زبوں حالی کا موسم ہے، بدن ہے خاک آلودہ
مگر اک زین جیسا شخص ہے، نایاب رہتا ہے

عبدالرؤف زین

غزل

تیرے جیسے تری مثال کے لوگ
ڈھونڈ کر لا وہی کمال کے لوگ

تیرے لہجے سے کچھ شکایت تھی
ورنہ عاشق تھے تیری چال کے لوگ

کاش مر جائے تو عروج میں ہی
منتظر ہیں ترے زوال کے لوگ

ساعتِ بے یقیں میں رہتے ہیں
سکھ بھی رکھتے نہیں سنبھال کے لوگ

رہ گئے آپ چُھپ اندھیرے میں
چاند تیری طرف اچھال کے لوگ

یاد کی خشک جھیل میں اب بھی
بیٹھے رہتے ہیں پاؤں ڈال کے لوگ

تیرے دکھ میں شریک ہونے کو
خود کو لائے ہیں غم میں ڈھال کے لوگ

حوصلے ہیں یہ کیا محبت میں
مسکراتے ہیں روگ پال کے لوگ

احمد امیر پاشا

غزل

پوچھ جا کے تو ذرا مزدور سے
ذہن ہوں جب بیش تر معذور سے

اتنی جلدی لوٹنے کا کچھ سبب
پوچھتے احباب ہیں مسرور سے

عمر کتنی چودھویں کے چاند کی
کوئی تو پوچھے بتِ مغرور سے

دودھ والی چائے یاں ملتی نہیں
اک بہشتی نے ہے پوچھا حور سے

اس کی تو پہچان ہے اس شہر میں
ڈھول ڈھپا کرتا ہے مجبور سے

اس نگر میں عدل نامی چیز کب
آپ واقف ہی نہیں دستور سے

کیف میں رہتا ہے عاصم دیر تک
حسن کو جو دیکھتا ہے دور سے

عاصم بخاری

غزل

کسی غریب کی عزت کو وہ اچھال آیا
کہ جب امیر کو امداد کا خیال آیا

ہم آسمان کے تارے تھے اب زمین پہ ہیں
کہ جب غرور میں آئے تو یہ زوال آیا

خدا کے شکر سے غربت میں دن گزرتے تھے
سکون چھن گیا جب پاس اپنے مال آیا

وہ جن کی کشتیاں میں نے لگائیں ساحل پر
مجھے ڈبونے کی خاطر انھی کا جال آیا

بنانے بیٹھا جو تصویر وہ گلابوں کی
تصورات مصور میں تیرا گال آیا

گزرتی عمر کا احساس تب ہوا اس کو
"جب اس کی زلف میں پہلا سفید بال آیا"

جب انجمن میں ہوئی دوستوں کی فرمائش
غزل کا شعر سناتا ہوا بلال آیا

بلال قمر خان

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

تجھ سے تو اٹھ سکے گا نہ یہ بار دوستی
مجھ پہ نہ آ پڑے کہیں دیوار دوستی

غزل

مہر علی

ہر فسانہ اسی اک باب میں رہ جائے گا
آدمی وقت کے گرداب میں رہ جائے گا

اس قدر محو نہ ہو حسن میں اپنے نرگس
تیرا ہونا اسی تالاب میں رہ جائے گا

ان گنت نقش بنا لیں گے یہ نقاش مگر
حسن مہتاب کا مہتاب میں رہ جائے گا

رائیگانی لئے جائیں گے نئے خواب کی اور
باقی سامان اسی خواب میں رہ جائے گا

خاکِ بے رنگ میں مل جائے گا رنگین بدن
عکس آئینۂ زرتاب میں رہ جائے گا

اور سوچو تو فقط ایک ہی لمحہ ہے یہاں
سب اسی لمحۂ کمیاب میں رہ جائے گا

غزل

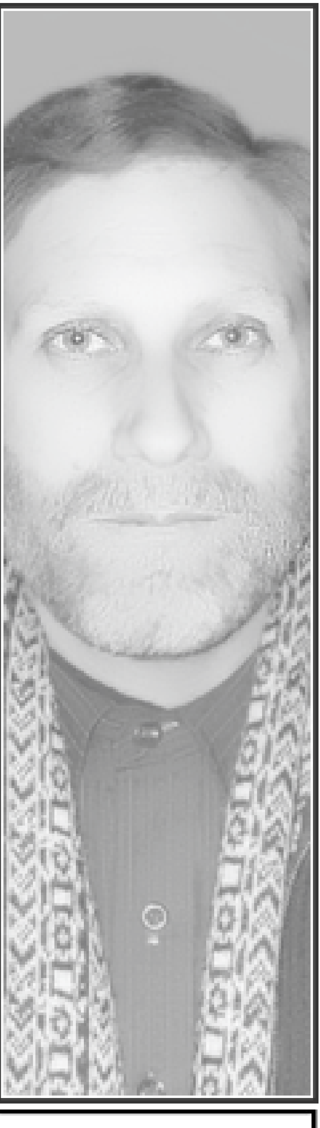

سہما نہیں ذرا سا بھی پہلی اُڑان میں
اُڑتا ہوں بے دھڑک میں کھُلے آسمان میں

سب کچھ سمیٹ کر میں نئے گھر میں آ گیا
یادیں ہی رہ گئی ہیں پرانے مکان میں

نکلی ہے اِک شگفتہ سی ٹہنی گلاب کی
کوئی پرانا زخم تھا شاید چٹان میں

پُل کا لرزنا تھا کہ مسافر اُتر گئے
بیٹھا رہا فقیر مگر درمیان میں

پیڑوں کے پیچھے گھات لگا لی ہے شیر نے
بیٹھا ہوا ہے چھپ کے شکاری مچان میں

سائے سے بچ کے دھوپ میں جلنے کو آ گیا
وحشت ہوئی عجیب مجھے سائبان میں

میری اُداسی دیکھ کے وہ مسکرا دیا
آخر میں پاس ہو ہی گیا امتحان میں

کس کس کا دھیان رکھنا ہے کس کا نہیں امر
اِتنی سی بات بھی نہیں رہتی ہے دھیان میں

امر مہکی

غزل

کم بخت دلِ زار کوئی سوختنی تھا
کھل کر بھی نہ کھلنے کا سبب کم سخنی تھا

اب آ کے کہیں خود میں سمٹ آیا ہوں، ورنہ
میں پہلے پہل خوئے تعلق میں غنی تھا

آخر کو یہی لوگ کسی روز کہیں گے
اک شخص یہاں خوب مقدر کا دھنی تھا

بیٹھا ہوں کہ کھل جائے کسی طور کوئی راز
اجداد کا پیشہ بھی یہی کوہکنی تھا

لہروں کے تسلسل نے کوئی بات سجھائی
دریا کا تو معمول یہی لاف زنی تھا

دیوار اٹھائی ہے کہ دنیا سے رہوں دور
میں خود سے گریزاں، کبھی خود یافتنی تھا

اک رزق فراواں جو نہیں تھا تو گلہ کیا
خوش ہوں کہ مرا باپ طبیعت کا غنی تھا

اب خود سے الجھنے کا کوئی رنج بھی کیوں ہو
دریا صفت اک شخص بہت انجمنی تھا

یوں ہے کہ نوید آج اُسے صاف بتا دو
آغازِ تعلق کا سبب خوش بدنی تھا

نوید صادق

غزل

جو کچھ بھی ہوا ساتھ میرے بھول چکا میں
اب جینے کی صورت ہے کروں ضبط بقا میں

ابلیس نے سو بار اُبھارا مجھے لیکن
دستِ شہِ کونین کی تھپکی سے دبا میں

میں عرش منڈیروں کو لگانے لگا تھا آگ
پھر ایک ستارے نے کہا رک تو رکا میں

انصاف کہاں جھوٹی تسلی نہیں ملتی
اسلام تیرے چاہنے والوں سے ڈرا میں

اک مست سواری پہ تھا بیٹھا ہوا مفلوج
سرکار کے کاندھے سے جو اترا تو چلا میں

نمرود کا شداد کا فرعون کا گھر تھا
جب خیمۂ تطہیر ملا اس میں گیا میں

جو کچھ بھی سہا تو نے میرے دل پہ رقم ہے
خضرِ رہِ کوثر نے کہا بڑھ تو بڑھا میں

اعجاز رضوی

قوم کا باجا بج رہا ہے!!! [طنز و مزاح]

جانے کس ستم ظریف کے ذہن میں اول اول یہ مکروہ خیال پیدا ہوا اور پتہ نہیں کس ستم ایجاد نے اسے بنا کر نہ صرف عملی شکل دی بل کہ حضرت اقبال کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کے اعلیٰ درجے سے ہم کنار بھی کرایا؛ کچھ معلوم نہیں ہو سکا ہم تو فقط اتنا ہی جانتے ہیں کہ مخلوق خدا کو ستانے اور انھیں جینے سے بے زار کرنے کا ایسا تیر بہدف سستا، ارزاں اور آساں آلہ ہم نے آج تک نہیں دیکھا اگست کا مہینہ شروع ہونے سے چند دن پہلے یہ مارکیٹ میں پہنچ جاتا ہے اور پھر یکم اگست سے چودہ اگست کی تقریبات آزادی تک ہر دکان کے سٹال پہ جھنڈیوں اور قومی پرچموں کے ساتھ یہ بھی وافر مقدار میں نہ صرف موجود رہتا ہے بل کہ ہر محب وطن شہری کے ہوش و حواس پر بھی چھایا رہتا ہے حیرت کی بات یہ ہے کہ چودہ اگست کے یوم آزادی کے بعد یہ ایسے غائب ہو جاتا ہے جیسے گدھے کے سر سے سینگ شاید اگلے جشن آزادی کے لیے اسے کسی سٹور میں محفوظ کر لیا جاتا ہے تاکہ ایک سال بعد اسے نئے جوش و جذبے کے ساتھ دوبارہ مارکیٹ میں لا کر جشن آزادی کی معمولات اور خاص و عام کی مشکلات میں خاطر خواہ اضافہ کیا جا سکے ممکن ہے آپ ہماری بے چینی و بے قراری کو محسوس کر کے سمجھ گئے ہوں گے کہ ہم اس منحوس ”باجے“ کا ذکر بد شروع کرنے لگے ہیں جس نے ان دنوں بجانے والے کو چھوڑ کر ہر چھوٹے بڑے، امیر غریب، کالے گورے اور مرد و زن کا جینا حرام کر رکھا ہے کہنے کو تو یہ ایک بے ضرر سا کھلونا ہے مگر اس کے کرتوت دیکھ کر اسے کھلونا کہنے کو دل ہی نہیں مانتا چودہ اگست والے اس ذوق و شوق سے بجایا جاتا ہے کہ بندے کا موسیقی اور آزادی پر سے اعتبار ہی اٹھ جاتا ہے بھئی! باجا تو اس بے چاری قوم کا پہلے ہی سے بجا ہوا ہے؛ اور کیا بجانا عزیز رشتہ دار، زیرک سیاست دان، من چلے افسران، خود سر جاگیرداران اور طاقت کے نشے میں چور با اختیار باشندگان پہلے ہی سے اس بے بس قوم کا باجا بجاتے چلے آ رہے ہیں اور اب بھی بجا رہے ہیں تو اب بھلا کان میں چلا چلا کر ”پھوں پھوں“ کرنے کی کیا ضرورت آن پڑی آخر جی ہاں! ہم اگست کے ابتدائی چودہ دنوں میں ہر بچے کے منہ میں دبے ”قومی باجے“ ہی کا ذکر کر رہے ہیں پلاسٹک کا بنا ہوا شوخ رنگ کا چھوٹا سا کھلونا جس کی لمبی نالی آواز کی شدت کو مزید بڑھا دیتی ہے اور اس سے اچانک برآمد ہونے والی کریہہ اور تیز آواز سننے والے کے چودہ طبق روشن کر دیتی ہے سامنے والے کے انجام سے بے خبر شوخ و شریر بچے اسے اچانک ہی مخالف کے کان کے پاس لا کر تیز پھونکوں سے بجا کر بھاگ کھڑے ہوتے ہیں (باجا بجانا اگر قبیح فعل نہ ہوتا تو بچے اسے بجانے کے بعد آخر بھاگتے ہی کیوں ہیں؟ کیا ہماری مخالفت کے

نور کمال شاہ

حق میں یہ دلیل کافی نہیں؟)
پتہ نہیں اس "باجے" کا آزادی کی تقریبات یا جشن سے کیا تعلق بنتا ہے اور اسے بجانے سے بابائے قوم یا مفکر پاکستان کے روحوں کو بھلا کیا سکون ملتا ہوگا مگر یہ حقیقت ہے کہ کسی تعلق کے جھنجھٹ سے آزاد یہ آلہ قومی دن کو یادگار بنانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے ہاں البتہ اسی احسان فراموش باجے کی بدولت گلی گلی اور قریہ بہ قریہ یہی دہائی سنائی دیتی ہے کہ چلیں جی شکر ہے آزادی تو مل گئی اور ملک بھی آزاد ہو گیا مگر آخر اس سب میں ہم بے چارے عوام کا کیا قصور تھا----

بچوں کی شکایت بجا اور ان کا یہ گلہ سر آنکھوں پر کہ "ہائیں ادیب ہو کر بھی اتنے بے ادب کہ بچوں سے بات کرنے تک کا شعور نہیں؛ شکوہ بے جا بھی کرے کوئی تو لازم ہے شعور؛ بچے تو ملک کا مستقبل، قوم کی امید اور معاشرے کا حسن کہلانے کے لائق ہوتے ہیں؛ وجود من سے ہے تصویر کائنات میں رنگ؛ ہماری ذرا سی خوشی تمہیں راس نہیں آتی ہم تو "کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں" کے مصداق تھوڑی بہت دل لگی ہی کرتے ہیں کیا تمہیں لکھنے کو اور کچھ نہیں ملا؟" تو عزیز و مکرم بچو! بے ادبی قبول؛ گستاخی معاف؛ ہمارا گلہ فقط آپ لوگوں سے کبھی بھی نہیں رہا اس لیے کہ ہم نے تو بڑے بڑے نوجوانوں اور باریش بزرگوں تک کو باجا بجاتے اور خوب بجاتے دیکھا ہے؛ بیٹھے ہیں ہم تہیہ طوفان کیے ہوئے؛ تو اس صورت حال میں فقط آپ لوگوں کو مورد الزام ٹھہرانے اور شکوہ بے جا کی مجال بھلا ہم میں کہاں------

اب آپ ہی فیصلہ کر لیں؛ ہم تو پہلے ہی سے آئی ایم ایف، مہنگائی، زلزلوں اور سیلابوں کے مارے ہوئے لوگ ہیں اس ڈری سہمی قوم کو مزید ڈرانا اور حواس باختہ کرنا آخر کہاں کا انصاف ہے آخر کب تک اس بے چاری قوم کی ہمت اور حوصلے کو آزمایا جاتا رہے گا یقین مانیں، ہم نے دکان کی دہلیز پر کھڑے شخص کو اچانک کان میں بجنے والی "پھوں، پھوں" کی آواز سے گھبراتے اور ہڑ بڑا کر گندے نالے میں گرتے دیکھا ہے بڑی بی کو بازار کے بیچوں بیچ ان لڑکوں کو کوسنے دیتے اور غیر سنسر شدہ گالیاں نکالتے سنا ہے جوان کے پیچھے مسلسل باجا بجا کر قومی جذبے کے زیر اثر جشن آزادی کی رونقوں میں اضافہ فرما رہے تھے ہم نے تو خوفزدہ ہو کر آگے بھاگتے کتوں کے پیچھے باجا بجا کر دوڑتے نوخیز جوانوں تک کا مشاہدہ کیا ہے ہم نے باجے کے سامنے کانوں میں انگلیاں ٹھونسے بدحواس بزرگوں کو بے چینی سے کلبلاتے دیکھا ہے اور مشاہدہ کیا ہے کہ بہت سے شریف اس آفت ناگہانی سے محفوظ رہنے کی خاطر گھروں سے نکلنا ہی پسند نہیں کرتے؛ بس اندر ہی پڑے رہتے ہیں۔

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ نوجوان ہمارا قیمتی اثاثہ اور وطن عزیز کا روشن مستقبل ہیں انھیں آزادی اور خود مختاری کا حق بھی حاصل ہے وہ بے شک اپنے حق اور اختیار کو استعمال کرتے ہوئے "باجا" ضرور بجائیں مگر ہمارے حق کو بھی تسلیم کر لیا کریں جہاں سے ہمارے "کان" شروع ہوتے ہیں وہیں پہ ان کا حق ختم ہو جانا چاہیے کانوں میں باجے بجانا اور قدموں میں پٹاخے پھوڑنا آخر کیسی اور کہاں کی خود مختاری ہے---------!!!

☆☆☆☆☆

خالدِ باکمال

ظاہر نہ کس کو ر نظر پر بھی ہوا میں
کیا فرق پڑا تجھ پہ کھلا یا نہ کھلا میں
(خالد احمد)

اس لیے کہ خالد احمد آئس برگ تھا۔ بظاہر جتنا نظر آتا تھا بحقیقت اس سے کہیں زیادہ بڑا تھا۔ آئس برگ سمندر میں تیرنے والا برف کا وہ پہاڑ ہے جس کی دیکھنے والوں کو صرف چھوٹی سی چوٹی نظر آتی ہے گویا برف کا ٹکڑا ہے جو پانی پر تیر رہا ہے لیکن بڑے بڑے جہاز اس سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتے ہیں۔ اگر کسی کو غیر سنجیدہ اور لاابالی نظر آیا تو ٹھیک ہی نظر آیا کہ اس کی شخصیت کا یہ پہلو بھی اتنا ہی حقیقی اور مبنی بر صداقت تھا جتنی کہ نظر نہ آنے والا پہلو، وہ جتنا کہ بڑا تھا اتنا بڑا نظر نہیں آتا تھا تو قصور دیکھنے والوں کا تھا:

والنجم تستصغر الابصار رویتہٗ
والذنب للطرف لا للنجم فی الصغر

(نگاہوں کو ستارہ جتنا ہے اس سے چھوٹا نظر آتا ہے تو اس کے چھوٹا دکھنے میں قصور نگاہوں کا ہے ستارے کا نہیں)

....

اہلِ خانہ اور دیگر قرابت داروں کے سوا اس کے ساتھ اُٹھنے بیٹھنے والوں کے لیے خالد ایک شاعر تھا اور بس لیکن اس کی شاعری کا بھی وہ حصہ قابلِ تحسین تھا، جو ان کی اپنی شاعری کی سطح سے بلند تر تھا اور اپنے مزاج، شاعری، شعر فہمی و شعر شناسی میں حاصل تربیت کے موافق و مطابق لگتا تھا۔ خالد کا یہ شعر ان میں سے ہر کسی کو یاد ہوگا:

ترکِ تعلقات پہ رویا نہ تو نہ میں
لیکن یہ کیا کہ چین سے سویا نہ تو نہ میں

....

اس کو اس لیے نقل نہیں کیا گیا کہ اسے پسند کرنے اور یاد رکھنے والے بدذوق ہیں۔

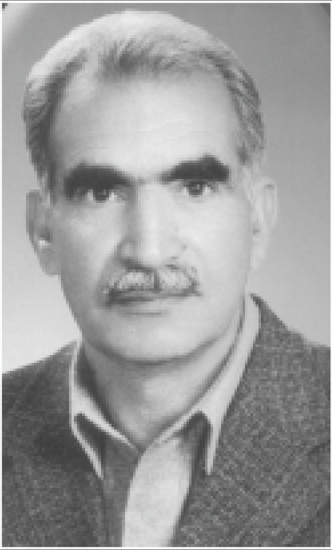

محمد ارشاد

بخدا یہ بات نہیں۔ یہ بات ہوتی تو یہی بات ان میں میری بھی شمولیت کی دلیل ہوتی۔ خالد کا یہ شعر اس کی شاعری میں یقیناً درتابدار ہے۔ میرا روئے سخن خالد کے علم وفضل کی جانب تھا اور ہے اس وجہ سے میں نے اسے آتش برگ کہا ہے۔ اس نے بعض ایسے اشعار بھی کہے ہیں جن کی طرف کسی نے ایسی توجہ نہیں دی جیسی اور جتنی توجہ کے مستحق ہیں۔

کوئی مہک نہ چُن سکا، کوئی چمک نہ سُن سکا
پھول بھلا دکھائے کیا؟ بھاؤ سبھاؤ ذات کے

گھر میں نہ اک چھدام تھا، چاند چراغِ بام تھا
چاند کی چھاؤں دھر دیا، ہم نے بھی سوت کات کے

خشک نہ سطرِ نم ہوتی، باب حدیثِ غم ہوتی
کاغذِ سادہ پر کھلے، رنگ قلم دوات کے

عکسِ جمال مستقل، کھینچ کے رہ گئے تجل
ہم کہ یہاں تھے میہماں، ایک دن ایک رات کے

....

ایک ایک شعر، ایک ایک مصرعے، ہر مصرعے کے ہر ہر ٹکڑے میں وہ نئی زبان اور نئے اسلوب کا حامل نظر آتا ہے۔ یہ زبان اور یہ اسلوب بڑی حد تک ایک بازبان و بااسلوب شاعر اختر حسین جعفری کی زبان و اسلوب کے مماثل ہے۔ مہک چننا، چمک سننا، ذات کے بھاؤ سبھاؤ ظاہر کرنے سے پھول کا عجز، ہمیں ایک نئے جہانِ معنی کا در کھلتا دکھائی دیتا ہے۔ ذات فلسفے میں Essenco اور Substance دونوں معنوں میں مستعمل ہے ان سے متعلق Attributes ہیں۔ یہی لفظ دوسرے سیاق وسباق میں جوہر کے لیے بھی آیا ہے جس سے متعلق اعراض ہیں۔ مہک چننے کی اور چمک سننے کی چیز نہیں سو پھول اپنی ذات کا بھاؤ اور سبھاؤ(☆) دکھا نہیں سکتا۔ حقیقت (reality) پوری منکشف نہیں ہو پاتی۔

چھدام کے معنی مجھے ایک لغت میں دیکھنے پڑے پیسے کا چوتھا حصہ، جس طرح ایک آنے کا چوتھا حصہ ایک پیسہ ہوا کرتا تھا۔ ایک پیسے میں دو دھیلے اور تین پائیاں ہوا کرتی تھیں۔ چھدام بلحاظ صورت املا چھے (6) دام ہوگا۔ چار دام ایک پیسہ لغت نویس کی لغزش لگتی ہے۔ ہوسکتا ہے لغت نویس کے زمانے چھ دام کی قوت خرید گھٹ کر چار دام رہ گئی ہو۔ خود آج کے دور میں ایک پیسے کا سکہ تو کیا ایک روپے کا سکہ بھی مفقود ہے۔ تانبے کے سکے میں تانبے کی قیمت

☆ بھاؤ Disbosition ۔ سبھاؤ Good Dispositin

اپنی قوت خرید کے زیادہ ہونے کی وجہ سے ختم ہو گئے۔ یہی ایک روپے کے سکے کے ساتھ ہوا۔ روپے اور پیسے کا ذکر صرف پٹرول، ڈیزل، گیس اور بجلی کی قیمتوں کے بڑھنے کے ساتھ سننے میں آتا ہے دیکھنے میں نہیں آتا۔ پانچ اور دس روپے کے سکے دکھائی دیتے ہیں اگر کوئی دیکھنا چاہے، لیکن دھات کی قیمت ان کی فیس ویلیو سے بڑھ گئی تو وہ بھی گدھے کے سینگ بن جائیں گے۔ دوسری عالمی جنگ میں جرمنی میں Inflation کا یہ حال تھا کہ ایک پیاز خریدنے کے ڈائش مارکس (کرنسی) کی پوری بوری لے جانی پڑتی تھی اور چند کلو پیاز کے لیے پوری ویگن، یہی حال ہمارا ابھی نظر نہ آنے والی عالمی جنگ کے سبب ہماری شرکت کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ یہ جنگ جو ابھی در پردہ لڑی جا رہی ہے پردے سے باہر لڑی گئی تو نہ کچھ بچے گا بلکہ کوئی نہ بچے گا اور جو بچ بھی گئے تو بقول برٹرینڈ رسل

They will fight with raehother for the last bringel.

والعصر انّ الانسان لفی خسر (زمانے کی قسم انسان تو ہے ہی خسارے میں) یا اس لیے کہ انّ الانسان لربہ لکنود (بے شک انسان تو ہے ہی اپنے رب کا ناشکرا) بقول اقبال:

بتوں سے تجھ کو امیدیں خدا سے نومیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے

خالد نے مجھے کہاں سے کہاں پہنچا کر دم لیا۔ چاند چراغ بام تھا، چاند کی چھاؤں دھر دیا ہم نے بھی سوت کات کے۔ وہی سوت جسے فارسی میں کتان، عربی میں قُطن اور انگریزی میں کاٹن (Cotton) کہتے ہیں۔ انگریز اس سے بذریعہ مصر آگاہ ہوئے۔ اب ہو سکتا مغربی یورپ کے گرمسیر علاقوں سپین میں کھجور کے ساتھ کپاس بھی کاشت کی جاتی ہو۔ ہندی کا مصدر کاتنا بھی کتان سے ہو سکتا ہے۔ لیکن یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ آریائی قبائل سردسیر علاقوں سے نکل کر گرمسیر ممالک میں جن میں انڈیا شامل ہے آئے۔ ان نئے ممالک میں آ کر ان کی زبان میں فرق پڑا۔ انگریزی میں گھوڑے کو ہارس کہا جاتا ہے، پشتو میں اَس اور گھوڑی کو اَسپہ لیکن انگریزی میں گھوڑی کے لیے mare؟ ممکن ہے یہ کسی اور زبان سے دخیل ہو۔ زمانہ ماقبل تاریخ میں جب لوگ درختوں کے پتوں سے تن ڈھانپتے ہوں گے اور بعد میں جانوروں کی کھالوں سے اور مِن بعد کتان سے آگاہ ہوئے ہوں گے اور کپڑا بنانا بھی سیکھ لیا ہوگا تو اس اساطیری دو میں کتان اور چاندنی کا

تعلق کا بھی کسی Myth میں ذکر ہوا ہوگا۔
جبھی تو غالب نے بھی کہا تھا:

کتانِ خویش می شویم بمہتاب

اور خالد نے اسی ضمن اور ذیل میں کہا:
چاند کی چھاؤں دھر دیا ہم نے بھی سوت کات کے

....

یہ پوری غزل مفتعلن مفاعلن مفتعلن مفاعلن (بحر رجز مثمن مطوی مخبون) میں ہے اور اقبال کی پسندیدہ بحور میں سے ایک یہ بھی ہے:

میری نوائے شوق سے شور حریم ذات میں
غلغلہ ہائے الاماں بتکدۂ صفات میں

گاہ مری نگاہ تیز چیر گئی دلِ وجود
گاہ الجھ کے رہ گئی میرے توہمات میں

تو نے یہ کیا غضب کیا مجھ کو بھی فاش کر دیا
میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں

....

اقبال کا کمال یہ ہے کہ جو سمجھے انھوں نے بھی واہ واہ کی جو نہیں سمجھے انھوں نے بھی واہ واہ کی۔ خالد کے ساتھ ایسا نہیں۔ اس کے ساتھ جو ہوا وہ اس سے پہلے بھی کئی اچھے اچھے شعرا کے ساتھ ہوا۔ میر انیس اگرچہ محدود کینوس کے شاعر تھے۔ ایک رنگ کا مضمون سو رنگ سے اور ہر رنگ نیا۔ لیکن ان کے میدان میں کسی نے سامنے آنے پر اسے وہ مقام نہیں ملا جس کا وہ اپنے آپ حقدار سمجھتے تھے۔

کیا ہو گئے وہ جوہریانِ سخن اس بار
ہر وقت جو اس جنس کے رہتے تھے طلبگار

اب ہے کوئی طالب نہ شناسا نہ خریدار
ہے کون! دکھائیں کسے ، یہ گوہر شہسوار

کس وقت یہاں چھوڑ کے ملکِ عدم آئے
جب اُٹھ گئے بازار سے گاہک تو ہم آئے

....

میر انیس سے صدیاں پہلے ایک عرب شاعر کو بھی اپنے زمانہ سے یہی شکایت تھی۔

لَمّا عَظُمتُ فلیس مصرٌ واسعی
لَمّا غَلا ثَمَنی عَدِمتُ المشتری

(جب میں ناچیز سے چیز ہوا تو ملک میرے لیے تنگ پڑ گیا۔ جب میری قیمت بڑھی تو گاہک ناپید ہو گئے)

....

میں خالد کو اقبال کے پایے کا شاعر ثابت نہیں کر رہا بلکہ ناقدری کے اس رویے کا ذکر کر رہا ہوں جو خالد سے بھی کئی بڑے شعرا کے نصیب میں تھی۔ انوری فردوسی، وسعدی کو فارسی کے عظیم ترین شعرا مانا گیا ہے (ہر چند یہ حافظ، نظامی کے شعرا کے ساتھ زیادتی ہے) انوری کو بھی یہ کہنا پڑ گیا تھا:

اے خواجہ مکن تا بتوانی طلب علم
کاندر طلب راتب ہر روزہ بمانی

رو مسخرگی و پیشہ کن مطربی آموز
تاداد خود از کہتر و مہتر بستانی
(اے محترم ہو سکے تو علم کی طلب چھوڑ دے۔
کہ تو روزانہ کی روٹی سے محروم رہے گا
جا جوکر (Jokar) بن جا اور گانا بجانا سیکھ
لے تا کہ ہر چھوٹے بڑے تیرے فن کی
داد دیں)

یہی کچھ آج کل ہمارے یہاں بھی ہو رہا ہے کئی اعلیٰ تعلیم یافتہ چھولوں سموسوں اور پکوڑوں کی ریڑھیاں لگائے نظر آتے ہیں سائنس کے مضامین میں برطانیہ، امریکہ، جرمنی سے ڈاکٹریٹ کر کے ملک و قوم کی خدمت کے جذبے سے سرشار نوجوان نوکری کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے ہیں لیکن: کس نمی پرسد کہ بھیا کیستی؟

خشک نہ سطرِ نم ہوئی، بابِ حدیثِ غم ہوئی
کاغذِ سادہ پر کھلے، رنگ قلم دوات کے

....

پاکستان کی یونی ورسٹیوں نے پی ایچ ڈی کی ڈگریاں، اسلامیات اور اردو میں ریوڑیاں سمجھ کر بانٹی ہیں۔ قاری فیوض الرحمٰن (مرحوم) کے نام کے ایک صاحب کے Thesis کا موضوع تھا، سرحد کے علمائے دیوبند اور اپنی ''ریسرچ'' کے لیے اتنی محنت ضرور کی کہ صوبے کے ہر کالج کو وزٹ کیا اور جو ملا اس سے پوچھا کہ اس کے گاؤں، قصبے یا شہر میں دیوبندی مسلک کا کوئی عالم ہو تو اس کے احوال مجھے لکھ دیجیے، نہایت مہربانی ہو گی۔ جس نے جو لکھ دیا، Compilo کیا اور پی ایچ ڈی ہو گئے۔ پینتیس چالیس سال پہلے بنوں کالج کے ایک استاد کا مجھے خط ملا، پی ایچ ڈی کرنا چاہ رہے تھے، موضوع تھا، پختونخوا میں بیدل کی روایت خط ہی بیدل کے چالیس پچاس اشعار بھی لکھ دیے کہ ان کی شرح بھی چاہیے۔ میں نے جوابی خط میں لکھا اس سلسلے میں انھیں پشاور یونیورسٹی کے فارسی ڈیپارٹمنٹ کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ جواب آیا کہ رجوع کیا لیکن ہر ایک نے یہ کہا کہ بیدل ہماری سمجھ سے باہر ہے۔ میں نے کہا جتنے اشعار آپ جناب نے بھجوائے ہیں اگر ان کی تشریح و تفہیم کرنے لگوں تو ڈیڑھ پونے دو سو صفحات تو ہوں گے ہی ہوں گے، کام میرا ہو گا نام آپ کا۔ جواب ملا آپ کا نام آجائے گا میرے نام کے ساتھ جب دیباچہ لکھوں گا۔ میں نے کہا میرے بھائی میرا نام ہے جبھی تو آپ نے مجھے خط لکھا ہے، گمنام ہوتا تو آپ مجھے کیسے خط لکھتے۔ اردو والوں کی ریسرچ ان موضوعات پر ہوتی ہے جن پر قلم دوات کے رنگ کھلاتے رہتے ہیں: علی بخش بیمار احوال و آثار، حیرت شملوی، احوال و آثار، وحشت

کلکوی احوال و آثار۔ ریسرچ کا معیار باعث عار، اسی طرح کی "تحقیقات" پڑھ کر کسی نے پی ایچ ڈی کا مطلب پاجامہ ہولڈنگ ڈیوائس نکالا۔ ان پی ایچ ڈیوں کو یہ بھی معلوم نہیں کہ Thesis ہوتا کیا ہے۔ حکیم آغا جان عیش نے اپنے بغل بچے میاں ہدہد کو مرزا غالب کے مقابلے میں شاعر بنا کر میدان میں اُتار دیا۔ کہاں مرزا غالب اور کہاں ہدہد۔ غالب یہی کہہ سکتا تھا اور کہا:

مراو غیر بیک جنس در شمار آرو
فغاں کہ نیست ز پروانہ فرق تا مگس

....

مکھی کا پروانے سے مقابلہ؟ پروانے کا مقابلہ جگنو سے ہوسکتا ہے مکھی سے نہیں۔ پروانہ اقبال کے نزدیک دریوزہ گرِ آتش بیگانہ سہی لیکن سعدی کے نزدیک پروانے کے اس وصف پر کسی کی نظر نہیں پڑی:

اے مرغ سحر عشق ز پروانہ بیاموز
کاں سوختہ راجاں شدو آواز نیامد

(اے مرغ سحر عشق دیکھنا ہے تو پروانے سے سیکھ جس نے بغیر ہائے وائے کیے اپنی جان اپنی معشوق پر واروی)

....

اور یہ بھی عشق ہی ہے جس نے خالد کو یہ کہنے پر آمادہ کیا:

عکسِ جمالِ مستقل، کھینچ کے رہ گئے خجل
ہم بھی یہاں تھے میہماں، ایک دن ایک رات کے

....

دن اور رات، بلیک اینڈ وائٹ میں جمال مستقل کی تصویر کشی ناکام کوشش ہے اور خجالت آور۔ جب پیغمبر صادق و مصدوق یہ کہے کہ ماعرفناک حق معرفتک (ہم تجھے ویسا نہیں پہچان سکے جیسا کہ پہچاننے کا حق ہے) اور یہی عرفان کی آخری حد بھی ہے تو ہم عامیوں کو تو یہی کہنا زیبا ہے:

من ذاتِ ترا بواجبی کے دانم
دانندۂ ذاتِ تو بجز ذاتِ تو نیست

(میں تیری ذات کو جیسا کہ حق ہے کیسے جانوں، جب تیری ذات کو جاننے والا ترے سوا کوئی ہے نہیں)

....

گزشتہ صدی کے دو عظیم ریاضی دانوں Principia Mathematica کے مصنفین اور فلسفیوں، اے این وائٹ ہیڈ اور برٹرینڈ رسل میں سے اول الذکر نے ریاضی کی مدد سے خدا کی ہستی کو ثابت کرنا چاہا، برٹرینڈ رسل قائل ہوتا تو یہ نہ کہتا کہ میں نہ یہ ثابت کرسکتا ہوں کہ خدا ہے نہ یہ ثابت کرسکتا ہوں کہ خدا نہیں ہے۔ اسی عجز کو بیان کرتے ہوئے صدیاں پہلے ایک اور ریاضی دان اور فلسفی

عمر خیام نے کہا ہے:

کس مشکلِ اسرار ازل را نہ کشاد
کس یک قدم از نہاد بیروں نہ نہاد
من می بینم زمبتدی تا استاد
عجز است بدستِ ہر کہ از مادر زاد

(اسرار ازل کی مشکلیں کوئی نہ حل کر پایا، اپنی نہاد سے ایک قدم باہر نہ دھر سکا- کیا مبتدی کیا استاد سب کو دیکھتا ہوں- وہ جسے ماں نے جنا ہے، اسے عجز بدست پایا)

....

یہی بات ایک اور ریاضی دان اور فلسفی خواجہ نصیر الدین طوسی نے یوں کہی:

آں قوم کہ راہ بیں فتادند و شدند
کس را بہ یقیں خبر نہ دادند و شدند
آں عقدہ کہ ہیچ کس نتانست کشاد
ہریک بندے برآں نہادند و شدند

....

وہ گرہ جو کسی سے کھل کیا پاتی، ہر گرہ کشا نے اس پر ایک اور گرہ لگائی اور چل دیا- اب کوئی کس کس گرہ کو کھولے- نطشے نے سچ کہا تھا- انسان کو عقل کائنات کا معمہ حل کرنے کے لیے نہیں دی گئی جو اس سے یہ کام لیتا چاہ رہا ہے- ایک کرسی، دو میز، تین درخت، چار پتھر، پانچ پتے تو معنی رکھتے ہیں لیکن ان چیزوں سے الگ ایک دو، تین، چار، پانچ کیا ہے؟ سب سے بڑا عدد کیا ہے؟ کسی کا بھی ذکر کریں اس میں ایک جمع کرنے سے اس سے بڑا عدد بن جائے گا- بقول عطار:

دل گرچہ دریں باد یہ بسیار شتافت
یک موے ندانست ولے موے شگافت
گرچہ ز دلم ہزار خورشید بتافت
آخر بکمالِ ذرۂ راہ نیافت

....

فلسفے کی پوری تاریخ اسی بات کی گواہی دے رہی ہے جس کا ذکر عطار اور اس سے پہلے سبھی کرتے چلے آرہے ہیں- آئن سٹائن سے کسی نے پوچھا کہ مجھے چند لفظوں میں اپنا نظریۂ اضافیت سمجھا دیں- جواب دیا:

Think away the universe, there is no space and no time. But don't dake is seriously.

معلوم نہیں پوچھنے والے نے بات کو سنجیدہ نہ لینے کا کیا مطلب نکالا کائنات کو محو خیال کرنے سے انسان جو کائنات میں موجود ہے، وہ بھی ساتھ ہی محو ہو گیا-

خرد ہوتی ہے زمان و مکان کی زُناری
نہ ہے زماں نہ مکاں لا الہ الا اللہ

....

بات تو سچ ہے لیکن بات یہاں ختم نہیں ہوتی بل کہ یہیں سے شروع ہوتی ہے- ہر کوئی

دشتِ تحیر میں پہنچ جاتا ہے:

مائیم دریں گنبدِ دیرینہ اساس
جویندۂ رخنۂ چو مور اندر طاس
حیراں شدہ در منزلِ امید و ہراس
سرگشتہ و چشم بستہ چوں گاوِ خراس

....

تمام ادیان اور اس کے پیروان کی آخری منزل ایک ہی ہے۔ یعنی ماعرفناک، ہندوؤں کی نیتی نیتی (نہ یہ نہ وہ) گوتم کی نہ اقرار نہ انکار بلکہ خاموشی۔

قسمے کہ ز چرخ پردہ در داشتہ ای
گر داشتہ ای خونِ جگر داشتہ ای
تا خواہی بود بے خبر خواہی بود
اے بے خبر از ہرچہ خبر داشتہ ای
(عطار)

(اس چرخ پردہ در سے تیری قسمت اگر ہے تو خونِ جگر ہے۔ تو جب تک ہے بے خبر ہی رہے گا۔ تجھے اگر کچھ خبر ہے بھی تو اس سے بھی بے خبر ہے)

اجزائے تو جملہ گوش می باید و بس
جانِ تو سخن نیوش می باید و بس
گفتی تو کہ مردِ راہ چوں می باید؟
نظارگی و خموش می باید و بس

(تیرے جملہ اجزا (اعضا) کو کان ہونا چاہیے یعنی پورے جسم کو اور جان کو سخن نیوش، تو پوچھتا رہے کہ مردِ راہ کیسے ہوا جاسکتا ہے تو سن دیکھنے اور چپ رہنے سے)

کائنات اور اس میں حیات وذی حیات، کے بارے میں پشینی داناؤں کے اقوال کو صفوی دور کے ایک قلندر منش رباعی گو سحابی نجفی استرآبادی نے احسن طریقے سے ملخص کرتے ہوئے کہا:

از خلقِ جہان و ہستیِ فانیِ ما
دانستہ نہ شد بغیرِ نادانیِ ما
حیرانیِ ما بود مراد از ہمہ چیز
یا رب چہ مراد است ز حیرانیِ ما

....

کیا عشق کیا خرد دونوں کا آغاز بھی حیرانی اور انجام بھی حیرانی ہے۔ خالد احمد کا جھکاؤ، تصوف بمعنی عرفان کی طرف تھا۔ حیرانی کیا ہے؟ نادانی (جہل) کی دریافت Discovery of ignorance اور جہل کی دریافت ہی علم سقراط سے کسی نے پوچھا آپ کا شمار یونان کے سات داناؤں میں ہوتا ہے آپ کی دانائی کی وجہ کیا ہے تو کہا میں دانا اس لیے ہوں کہ میں جانتا ہوں کہ میں دانا نہیں اس بل کہ اسی انسانی صورت کا ذکر کرتے ہوئے خالد نے کہا ہے:

عکسِ جمالِ مستقل کھینچ کے رہ گئے خجل
ہم کہ یہاں ہیں میہماں ایک دن ایک رات کے

☆☆☆☆☆

عبداللہ بن اُبَی [بقیہ حصہ]

آگے چل کر حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں، ''میرے پیچھے رسول اللہؐ نے علیؓ اور اسامہؓ بن زید کو بلایا اور ان سے مشورہ طلب کیا۔ اسامہؓ نے میرے حق میں کلمۂ خیر کہا ''یارسول اللہؐ، بھلائی کے سوا آپ کی بیوی میں کوئی چیز ہم نے نہیں پائی۔ یہ سب کچھ کذب اور باطل ہے جو اڑایا جارہا ہے۔'' رہے علیؓ تو انھوں نے کہا، ''یارسولؐ اللہ عورتوں کی کمی نہیں ہے، آپ اس کی جگہ دوسری بیوی کر سکتے ہیں۔ اور تحقیق کرنا چاہیں تو خدمت گار لونڈی کو بلا کر حالات دریافت فرمائیں۔'' چنانچہ خدمت گار کو بلا کر پوچھ گچھ کی گئی۔ اس نے کہا، ''اس خدا کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے، میں نے ان میں کوئی برائی نہیں دیکھی جس پر حرف رکھا جاسکے۔ بس اتنا عیب ہے کہ میں آٹا گوندھ کر کسی کام کو جاتی ہوں اور کہہ جاتی ہوں کہ بیوی ذرا آٹے کا خیال رکھنا، مگر وہ سو جاتی ہیں اور بکری آکر آٹا کھا جاتی ہے۔''

''اسی روز رسولؐ اللہ نے خطبہ میں فرمایا ''مسلمانو! کون ہے جو اس شخص کے حملوں سے میری عزت بچائے جس نے میرے گھر والوں پر الزامات لگا کر مجھے اذیت پہنچانے کی حد کر دی ہے؟ بخدا میں نے نہ تو اپنی بیوی ہی میں کوئی برائی دیکھی ہے، اور نہ اس شخص میں جس کے متعلق تہمت لگائی جاتی ہے۔ وہ تو کبھی میری غیر موجودگی میں میرے گھر آیا بھی نہیں۔'' اس پر اُسید بن حُضیر نے یا سعد بن معاذ نے اٹھ کر کہا ''یارسول اللہ اگر وہ ہمارے قبیلے کا آدمی ہے تو ہم اس کی گردن مار دیں، اور اگر ہمارے بھائی خزرجیوں میں سے ہے تو آپ حکم دیں ہم تعمیل کے لیے حاضر ہیں۔ یہ سنتے ہی سعد بن عُبادہ، رئیس خزرج اٹھ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے ''جھوٹ کہتے ہو تم ہرگز اسے نہیں مار سکتے۔ تم اس کی گردن مارنے کا نام صرف اس لیے لے رہے ہو کہ وہ خزرج میں سے ہے۔ اگر وہ تمھارے قبیلے کا آدمی ہوتا تو کبھی نہ کہتے کہ ہم اس کی گردن مار

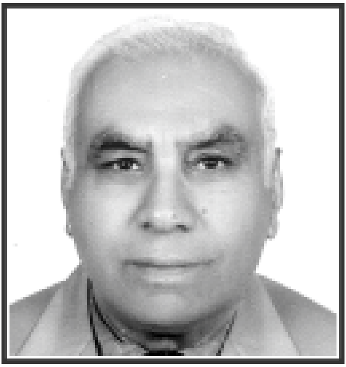

پیروز بخت قاضی

دیں گے۔" اُسید بن حُضیر نے جواب میں کہا "تم منافق ہو، اسی لیے منافقوں کی حمایت کرتے ہو۔" اس پر مسجد نبوی میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا حالانکہ رسول اللہ منبر پر تشریف رکھتے تھے۔ قریب تھا کہ اوس اور خزرج مسجد ہی میں لڑ پڑتے، مگر رسول اللہ نے ان کو ٹھنڈا کیا اور پھر منبر سے اُتر آئے۔"

عبداللہ بن اُبَی نے یہ شوشہ چھوڑ کر بیک وقت کئی شکار کرنے کی کوشش کی۔ ایک طرف اس نے رسولؐ اللہ اور حضرت ابوبکرؓ صدیق کی عزت پر حملہ کیا۔ دوسری طرف اس نے اسلامی تحریک کے بلند ترین وقار کو گرانے کی کوشش کی۔ تیسری طرف اس نے یہ ایک ایسی چنگاری پھینکی تھی کہ اگر اسلام اپنے پیرو وں کی کایا نہ پلٹ چکا ہوتا تو مہاجرین اور انصار، اور خود انصار کے دونوں قبیلے بھی آپس میں لڑ مرتے۔ یہ وہ حالات تھے، جن میں پہلے حملے کے موقع پر سورۃ احزاب کے آخری چھ رکوع نازل ہوئے اور دوسرے حملے کے موقع پر سورۃ نور اتری۔ اور ازواج مطہرات کے لیے اور تمام مسلمان عورتوں کے لیے ہدایات اور احکام نازل کیے گئے۔ اور معاشرتی اصلاح کے لیے ہدایات دی گئیں۔ عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں قرآن مجید کی سورۃ المنٰفقون نازل ہوئی جس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ:

"اے نبیؐ جب یہ منافق تمھارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں "ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ یقیناً اللہ کے رسولؐ ہیں۔" ہاں، اللہ جانتا ہے کہ تم ضرور اس کے رسول ہو، مگر اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافق قطعی جھوٹے ہیں۔ انھوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا رکھا ہے، اور اس طرح یہ اللہ کے راستے سے خود رکتے اور دنیا کو روکتے ہیں۔ کیسی بُری حرکتیں ہیں جو یہ لوگ کر رہے ہیں۔ یہ سب کچھ اس وجہ سے ہے کہ ان لوگوں نے ایمان لا کر پھر کفر کیا، اس لیے ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی، اب یہ کچھ نہیں سمجھتے۔ انھیں دیکھو تو اِن کے جثے تمھیں بڑے شاندار نظر آئیں۔ بولیں تو تم ان کی باتیں سنتے رہ جاؤ، مگر اصل میں یہ گویا لکڑی کے کندے ہیں جو دیوار کے ساتھ چُن کر رکھ دیے گئے ہوں - (حضرت عبداللہ بن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ عبداللہ بن اُبَی بڑے ڈیل ڈول کا تندرست، خوش شکل اور چرب زبان آدمی تھا۔ اور یہی شان اس کے بہت سے ساتھیوں کی تھی۔ یہ سب مدینہ کے رئیس لوگ تھے۔ جب رسول اللہ کی مجلس میں آتے تو دیواروں سے تکیے لگا کر بیٹھتے اور بڑی لچھے دار باتیں کرتے۔ ان کے جثے بُشرے کو دیکھ کر اور ان کی باتیں سُن کر کوئی یہ گمان تک نہیں کر سکتا تھا کہ بستی کے یہ معززین اپنے کردار کے لحاظ سے اتنے ذلیل ہوں گے۔) ہر زور کی آواز کو

یا اپنے خلاف سمجھتے ہیں۔ یہ پکے دشمن ہیں، ان سے بچ کر رہو، اللہ کی مار ان پر، یہ کدھر الٹے پھرائے جا رہے ہیں۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ تاکہ اللہ کا رسول تمھارے لیے مغفرت کی دعا کرے، تو سر جھٹکتے ہیں اور تم دیکھتے ہو کہ وہ بڑے گھمنڈ کے ساتھ آنے سے رکتے ہیں۔ اے نبی تم چاہے ان کے لیے مغفرت کی دعا کرو یا نہ کرو، ان کے لیے یکساں ہے۔ اللہ ہرگز انھیں معاف نہ کرے گا۔ اللہ فاسق لوگوں کو ہرگز ہدایت نہیں دیتا۔ یہ وہی لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ رسولؐ کے ساتھیوں پر خرچ کرنا بند کر دو تاکہ یہ منتشر ہو جائیں۔ حالانکہ زمین اور آسمانوں کے خزانوں کا مالک اللہ ہی ہے، مگر یہ منافق سمجھتے نہیں ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ ہم مدینے واپس پہنچ جائیں تو جو عزت والا ہے وہ ذلیل کو وہاں سے نکال باہر کرے گا۔ حالانکہ عزت تو اللہ اور اس کے رسولؐ اور مومنین کے لیے ہے، مگر یہ منافق جانتے نہیں ہیں۔ (سورۃ المنٰفقون 63:1 تا 8)

منافقین کی فتنہ پردازیوں اور ان کے لگائے گئے بہتانوں سے جو مسلمان متاثر ہو گئے تھے ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ سورۃ نور میں فرماتا ہے کہ:

"جو لوگ یہ بہتان گھڑ لائے ہیں وہ تمھارے ہی اندر کا ایک ٹولہ ہیں۔ اس واقعہ کو اپنے حق میں شر نہ سمجھو بلکہ یہ بھی تمھارے لیے خیر ہی ہے، جس نے اس میں جتنا حصہ لیا اس نے اتنا ہی گناہ سمیٹا۔ اور جس شخص نے اس کی ذمہ داری کا بڑا حصہ اپنے سر لیا اس کے لیے تو عذاب عظیم ہے۔ جس وقت تم لوگوں نے اسے سنا تھا اُسی وقت کیوں نہ مومن مردوں اور مومن عورتوں نے اپنے آپ سے نیک گمان کیا۔ اور کیوں نہ کہہ دیا کہ یہ صریح بہتان ہے؟" (النور 24: 11 تا 12)

اس واقعہ کی روایت کا اگلا حصہ حضرت عائشہؓ بیان فرماتی ہیں:

"اس بہتان کی افواہیں کم و بیش ایک مہینے تک شہر میں اُڑتی رہیں۔ نبیؐ سخت اذیت میں مبتلا رہے۔ میں روتی رہی۔ میرے والدین انتہائی پریشانی اور رنج و غم میں مبتلا رہے۔ آخر کار ایک روز حضورؐ تشریف لائے اور میرے پاس بیٹھے۔ اس پوری مدت میں آپ کبھی میرے پاس نہ بیٹھے تھے۔ حضرت ابوبکر اور اُمّ رومان (حضرت عائشہ کی والدہ) نے محسوس کیا کہ آج کوئی فیصلہ کن بات ہونے والی ہے، اس لیے وہ دونوں بھی پاس آ کر بیٹھ گئے۔ حضور نے فرمایا عائشہ، مجھے تمھارے متعلق یہ خبریں پہنچی ہیں۔ اگر تم بے گناہ ہو تو امید ہے کہ اللہ تمھاری برأت ظاہر فرما دے گا۔ اور اگر واقعی تم کسی گناہ میں مبتلا ہوئی ہو تو اللہ سے توبہ کرو اور معافی مانگو۔ بندہ جب اپنے گناہ کا معترف ہو کر توبہ کرتا ہے تو اللہ معاف کر دیتا ہے۔ یہ

بات سن کر میرے آنسو خشک ہو گئے۔ میں نے اپنے والد سے عرض کیا آپ رسول اللہ کی بات کا جواب دیں۔ انھوں نے فرمایا بیٹی میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کہوں۔ میں نے اپنی والدہ سے کہا آپ ہی کچھ کہیں۔ انھوں نے بھی یہی کہا کہ میں حیران ہوں کیا کہوں۔

اس پر میں بولی آپ لوگوں کے کانوں میں ایک بات پڑ گئی ہے اور دلوں میں بیٹھ چکی ہے۔ اب اگر میں کہوں کہ میں بیگناہ ہوں ــــ اور اللہ گواہ ہے کہ میں بیگناہ ہوں ــــ تو آپ لوگ نہ مانیں گے۔ اور اگر خواہ مخواہ ایک ایسی بات کا اعتراف کروں جو میں نے نہیں کی ــــ اور اللہ جانتا ہے کہ میں نے نہیں کی ــــ تو آپ لوگ مان لیں گے۔ میں نے اس وقت حضرت یعقوبؑ کا نام یاد کرنے کی کوشش کی مگر نہ یاد آیا۔ آخر میں نے کہا اس حالت میں میرے لیے اس کے سوا اور کیا چارہ ہے کہ وہی بات کہوں جو حضرت یوسفؑ کے والد نے کہی تھی کہ ''فصبر جمیل''۔ یہ کہہ میں لیٹ گئی اور دوسری طرف کروٹ لے لی۔ میں اس وقت اپنے دل میں کہہ رہی تھی کہ اللہ میری بیگناہی سے واقف ہے اور وہ ضرور حقیقت کھول دے گا۔ اگرچہ یہ بات تو میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھی کہ میرے حق میں وحی نازل ہو گی جو قیامت تک پڑھی جائے گی۔ میں اپنی ہستی کو اس سے کم تر سمجھتی تھی کہ اللہ خود میری طرف سے بولے۔ مگر میرا یہ گمان تھا کہ رسول اللہ کوئی خواب دیکھیں گے جس میں اللہ تعالیٰ میری برأت ظاہر فرما دے گا۔ اتنے میں حضورؐ پر یکا یک وہ کیفیت طاری ہو گئی جو وحی نازل ہوتے وقت ہوا کرتی تھی حتیٰ کہ سخت جاڑے کے زمانے میں بھی موتی کی طرح آپ کے چہرے سے پسینے کے قطرے ٹپکنے لگتے تھے۔ ہم سب خاموش ہو گئے۔ میں تو بالکل ہی بے خوف تھی، مگر میرے والدین کا حال یہ تھا کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ وہ ڈر رہے تھے کہ دیکھیے اللہ کیا حقیقت کھولتا ہے۔ جب وہ کیفیت دور ہوئی تو حضور بے حد خوش تھے۔ آپ نے ہنستے ہوئے پہلی بات جو فرمائی وہ یہ تھی کہ مبارک ہو عائشہ اللہ نے تمھاری برأت نازل فرما دی۔ اور اس کے بعد حضور نے دس آیات سنائیں (یعنی سورۃ نور کی آیت نمبر 11 سے 21 تک)۔ میری والدہ نے کہا، اٹھو اور رسول اللہ کا شکریہ ادا کرو، میں نے کہا میں نہ ان کا شکریہ ادا کروں گی نہ آپ دونوں کا، بل کہ اللہ کا شکر کرتی ہوں جس نے میری برأت نازل فرمائی۔ آپ لوگوں نے تو اس بہتان کا انکار تک نہ کیا۔

اس واقعے کو قرآن میں سورۃ توبہ کی آیت نمبر 11 میں اِفک کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اِفک کے معنی ہیں بات کو الٹ دینا، حقیقت کے خلاف کچھ سے کچھ بنا دینا۔ اس مفہوم کے

اعتبار سے یہ لفظ قطعی جھوٹ اور افترا کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ اور اگر کسی الزام کے لیے بولا جائے تو اس کے معنی سراسر بہتان کے ہیں۔

نزولِ وحی کے بعد بھی منافقین کو کچھ نہ کہا جن کی وجہ سے حضورؐ مہینہ بھر سخت اذیت میں مبتلا رہے تھے۔ صرف ان تین مسلمانوں کو حد لگوا دی جن پر جرم قذف ثابت تھا۔

بنی المصطلق کو شکست دینے کے بعد لشکرِ اسلام اس بستی میں ٹھہرا ہوا تھا جو مُریسیع نامی کنویں پر آباد تھی۔ یہاں دو صاحبوں کا پانی پر جھگڑا ہو گیا۔ عبداللہ بن ابی نے اس پر بھی فتنہ پردازی کی اور کہا کہ ''مدینہ پہنچ کر ہم میں سے جو عزت والا ہے وہ ذلیل کو نکال دے گا۔'' اس کی مراد حضورؐ پر ایمان لانے والوں کی تھی۔ جس مجلس میں یہ بات کہی گئی وہاں اتفاق سے حضرت زید بن ارقم بھی موجود تھے جو اس وقت کم عمر لڑکے تھے۔ انھوں نے یہ باتیں سن کر اپنے چچا سے ان کا ذکر کیا اور ان کے چچا نے جو انصار کے رئیسوں میں سے تھے، جا کر رسول اللہ کی خدمت میں سارا واقعہ بیان کر دیا۔ حضورؐ نے زید کو بلا کر دریافت کیا تو انھوں نے جو کچھ سنا تھا دہرا دیا۔ حضورؐ نے فرمایا شاید تم ابنِ ابی سے ناراض ہو، ممکن ہے تم سے سننے میں غلطی ہوئی ہو، ممکن ہے تمھیں شبہ ہو گیا ہو کہ ابن ابی یہ کہہ رہا ہے، مگر زید نے قسم کھا کر کہا کہ اس نے یہ باتیں کہتے سنا ہے۔

اس پر حضورؐ نے ابن ابی کو بلا کر پوچھا تو وہ صاف مکر گیا اور قسمیں کھانے لگا کہ میں نے یہ باتیں ہرگز نہیں کہیں۔ انصار کے لوگوں نے بھی کہا کہ حضور لڑکے کی بات پر اعتبار نہ فرمایئے۔ شاید اسے وہم ہو گیا ہو۔ ابن ابی ہمارا شیخ اور بزرگ ہے۔ قبیلے کے بڑے بوڑھوں نے زید کو بھی ملامت کی اور وہ بیچارے رنجیدہ ہو کر اپنی جگہ بیٹھ رہے۔ مگر حضور زید کو بھی جانتے تھے اور عبداللہ بن اُبَی کو بھی، اس لیے آپ سمجھ گئے کہ اصل بات کیا ہے۔

حضرت عمرؓ کو علم ہوا تو انھوں نے حضورؐ سے اس منافق کی گردن اڑانے کی اجازت طلب کی اور کہا کہ وہ اگر یہ مناسب نہ سمجھیں تو خود انصار ہی میں سے معاذ بن جبل، عباد بن بشر یا کسی اور کو حکم دیجیے کہ وہ اسے قتل کر دیں مگر حضور نے فرمایا ''ایسا نہ کرو، لوگ کہیں گے کہ محمدؐ اپنے ہی ساتھیوں کو قتل کر رہا ہے۔'' اس کے بعد آپ نے فوراً ہی کوچ کا حکم دے دیا جس کی تفصیل اوپر بیان کی جا چکی ہے۔ مسلسل 30 گھنٹے چلتے رہنے سے لوگ تھک کر چُور ہو گئے اور پڑاؤ پہ پہنچتے ہی سو گئے۔

رفتہ رفتہ یہ بات تمام انصار میں پھیل گئی اور ان میں ابن ابی کے خلاف سخت غصہ پیدا ہو گیا۔ لوگوں نے ابن ابی سے کہا کہ جا کر رسول اللہ سے معافی مانگو۔ مگر اس نے ترخ کر جواب دیا ''تم نے کہا تھا ان پر ایمان لاؤ، میں ایمان

لے آیا۔ تم نے کہا اپنے مال کی زکوۃ دو، میں نے زکوۃ بھی دے دی اب بس یہ کسر رہ گئی ہے کہ میں محمدؐ کو سجدہ کروں۔'' ان باتوں سے اس کے خلاف مومنین انصار کی ناراضی اور زیادہ بڑھ گئی اور ہر طرف سے اس پر پھٹکار پڑنے لگی۔ جب یہ قافلہ مدینہ طیبہ میں داخل ہونے لگا تو عبداللہ بن ابی کے صاحبزادے، جن کا نام بھی عبداللہ ہی تھا، تلوار سونت کر باپ کے آگے کھڑے ہو گئے اور بولے، ''آپ نے کہا تھا کہ مدینہ کو واپس پہنچ کر عزت والا ذلیل کو نکال دے گا۔ اب آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ عزت آپ کی ہے یا اللہ اور اس کے رسول کی۔ خدا کی قسم آپ مدینہ میں داخل نہیں ہو سکتے جب تک رسولؐ اللہ آپ کو اجازت نہ دیں۔'' اس پر ابن ابی چیخ اٹھا، ''خزرج کے لوگو! ذرا دیکھو، میرا بیٹا ہی مجھے مدینہ میں داخل ہونے سے روک رہا ہے۔''

لوگوں نے یہ خبر حضورؐ تک پہنچائی اور آپ نے فرمایا ''عبداللہ سے کہو اپنے باپ کو گھر آنے دے۔'' عبداللہ نے کہا کہ ''ان کا حکم ہے تو اب آپ داخل ہو سکتے ہیں۔'' اس وقت حضورؐ نے حضرت عمرؓ سے فرمایا ''کیوں عمر، اب تمہارا کیا خیال ہے؟ جس وقت تم نے کہا تھا کہ مجھے قتل کرنے کی اجازت دیجیے اس وقت اگر تم اسے قتل کر دیتے تو بہت سی ناکیں اس پر پھڑ کنے لگتیں۔ آج اگر میں اس کے قتل کا حکم دوں تو اسے قتل تک کیا جا سکتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا'' خدا کی قسم، اب مجھے معلوم ہو گیا کہ اللہ کے رسول کی بات میری بات سے زیادہ مبنی بر حکمت تھی۔''

ان حالات میں مدینہ پہنچنے پر سورۃ المنفقون نازل ہوئی عبداللہ بن ابی کا منافقانہ کردار اب پوری طرح بے نقاب ہو چکا تھا اور ہر شخص کی نظر میں، حتیٰ کہ اپنے بیٹے تک کی نظر میں اس کا سرداری تفاخر اور عزت و حمایت خاک میں مل چکی تھی۔ اور وہ ذلیل و خوار ہو چکا تھا۔ اس کے بعد وہ زیادہ عرصہ زندہ نہ رہا اور جلدی ہی مر گیا۔ اس کی نماز جنازہ پڑھی گئی مگر اللہ تعالیٰ نے سورۃ المنافقون میں ارشاد فرمایا کہ:

''اے نبیؐ تم چاہے ان کے لیے مغفرت کی دعا کرو یا نہ کرو، ان کے لیے یکساں ہے، اللہ ہرگز انھیں معاف نہ کرے گا۔ اللہ فاسق لوگوں کو ہرگز ہدایت نہیں دیتا۔'' (المنفقون 63: 6)

یعنی دعائے مغفرت صرف ہدایت یافتہ لوگوں ہی کے حق میں مفید ہو سکتی ہے۔ جو شخص ہدایت سے پھر گیا ہو اور جس نے اطاعت کے بجائے فسق و نافرمانی کی راہ اختیار کر لی ہو، اس کے لیے کوئی عام آدمی تو درکنار، خود اللہ کا رسول بھی مغفرت کی دعا کرے تو اسے معاف نہیں کیا جا سکتا۔

☆☆☆☆☆

''خوشبو کی دیوار کے پیچھے'' ایک جھانک

جلیل عالی

تھیوری تو یہ کہتی ہے کہ ادبی فن پارہ تخلیق ہونے کے بعد اپنے خالق سے رشتہ ختم کر دیتا ہے اور ایک آزاد و خود مختار مظہر بن جاتا ہے۔ قاری اپنی قرأت سے اسے معنی دیتا ہے۔ لہٰذا اس کے تخلیق کار بارے کچھ جاننے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یوں خودنوشت مصنف کی کوئی مجبوری ہو تو ہو تخلیقات کے مطالعے میں یہ بے حوالہ شے ہوتی ہے۔ لیکن عملی طور پر ایسا ممکن نہیں۔ اگر قاری کو اپنی مرضی کی متنی قرأت کی آزادی ہے تو اس پر اپنے پسندیدہ متن کے تخلیق کار بارے معلومات میں دلچسپی پر کیسے پابندی لگائی جا سکتی ہے۔ اور اگر اس کی آزادی اسے تخلیق کار اور تخلیق کے درمیان رشتوں کے ناطے کچھ اور پہلو بھی سجھا جاتی ہے تو اسے تعبیر کا حصہ بنانے میں کیا ہرج ہے؟ اور تنقیدی و تعبیری ہدایت ناموں سے قاری کی آزادی کو ہینڈل کرنے کا کیا جواز ہے؟ اگر مصنف کی شخصیت اور احوالِ حیات سے آشنائی کے بعد اس کے تخلیقی متون قاری سے بے ساختہ مکالمہ کرنے لگ جائیں تو کیا تعبیریں اور بھی ثروت مند نہیں ہو جاتیں۔ اس لیے کسی نقاد یا قاری کو فن پارے

کے مصنف سے کوئی مسئلہ ہو تو اس کی مرضی مگر اسے اصول بنا کر قاری پر لادنے کی کیا تک ہے؟ لہٰذا ہم اپنی خوشی اور اپنی آزاد مرضی سے اپنی پسندیدہ تحریروں کے خالق اور اپنے محبوب محمد حمید شاہد کی خودنوشت پڑھیں گے اور اس پر بات بھی کریں گے۔

یہ خودنوشت بیسیوں جہتوں سے اہمیت رکھتی ہے مگر میں صرف چند پہلوؤں سے اس پر مختصر اظہار خیال کروں گا۔ مجھے مصنف کے ذاتی و خاندانی حالات اور ملازمت کے احوال کے ساتھ ساتھ ادبی، تنقیدی، تاریخی اور تہذیبی حوالوں سے یہ کتاب بہت اہم محسوس ہوئی ہے۔ جہاں تک ذاتی و خاندانی حالات کا تعلق ہے۔ کسی عام شخص کے حالات زندگی سے ہمیں کچھ لینا دینا ہو کہ نہ ہو کسی بھی حوالے سے مشہور و نامور ہستیوں کے احوال حیات بارے تجسس کا پیدا ہو جانا ایک فطری امر ہے۔

ادبی حوالہ

ادبی حوالے سے دیکھا جائے تو سب سے پہلے یہ کتاب اپنے خوب صورت انداز تحریر کی وجہ سے ہمیں متوجہ کرتی ہے۔ یہ ایک ایسے صاحب اسلوب تخلیقی نثر نگار کے قلم کی دین ہے جو کہانی بیان کرتے ہوئے پڑھنے والے کو اپنی گرفت سے نکلنے نہیں دیتا۔ یہ کتاب اگرچہ فکشن نہیں، زندگی کے حقیقی واقعات کی روداد ہے مگر محمد حمید شاہد کے جادوئی قلم کا کرشمہ جانیے کہ خود میرے ساتھ یہ ہوا کہ اشاعت کے کچھ ہی عرصے بعد عنایت ہوئی تو دو تین نشستوں میں قرأت مکمل کر لی تھی، مگر اب جو تقریب میں کچھ کہنے کے اعزاز کی اطلاع ملی اور ذرا جستہ جستہ دیکھ لینے کا ارادہ کیا تو دوبارہ ایک رو میں شروع سے آخر تک پڑھ گیا۔

اس میں حمید شاہد کی ادبی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ اس کے بعض نمائندہ افسانوں کے تخلیقی پس منظر سے بھی آگاہی ہوتی ہے۔ بے شک ایک سنجیدہ قاری کوئی اور بھی مربوط تعبیر کر سکتا ہے مگر تخلیق کار کے اپنے بیان کردہ پس منظر سے ابھرنے والی تفہیم کا بھی ایک اپنا ہی حظ اور حیثیت ہوتی ہے۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ بے شک کوئی افسانہ مصنف کی اپنی زندگی کے کسی حقیقی وقوعے سے تعلق رکھتا ہو مگر ایک وقیع تخلیقی فن پارہ بننے میں وہ کیسی کیسی قلب ماہیت سے گزرتا ہے۔ ان تفصیلات سے حمید شاہد کے تخلیقی عمل کو سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے۔

کتاب میں بہت سی ادبی شخصیات، واقعات اور تقریبات کا تذکرہ تو بعض جگہ رپورتاژ کی صورت اختیار کرتا دکھائی دیتا ہے۔ بل کہ ان میں سے بعض حصوں کو تو

متعلقہ شخصیات کے مختصر خاکوں کے طور پر بھی پڑھا جاسکتا ہے۔

تنقیدی حوالہ

محمد حمید شاہد ایک ویژنری قلمکار ہے۔ کسی بھی صورت حال کی پیش کاری میں اس کی تجزیاتی فطرت کی عمل آرائی اسے ایک دانشور قلمکار کے طور پر متعارف کراتی ہے۔ جب کوئی تخلیق کار ادبی تنقید کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو میں اسے ادب و تنقید دونوں کے لیے نیک شگون خیال کرتا ہوں۔ تخلیق کار نقاد تخلیقی عمل کا حقیقی رازداں ہوتا ہے۔ وہ اپنی تنقیدی تحریروں میں نہ صرف فن پارے کے اصل تخلیقی نواح کے قریب رہ کر بات کرتا ہے بل کہ اپنی تحریروں میں وہ بعض ایسے لطیف اشارے کر جاتا ہے جو سکہ بند نقادوں کو بہت کچھ سمجھا جاتے ہیں۔ حمید شاہد ایک ایسا ہی تخلیق کار نقاد ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ وہ فکشن اور شاعری دونوں سے یکساں انصاف کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ عام طور پر فکشن نگار اور فکشن کے نقاد شاعری بارے ایک فاصلے سے بات کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ میں نے ممتاز مفتی صاحب کے منہ سے کئی بار یہ سنا کہ شاعری تمام فنون سے افضل ہے۔ مگر نہ جانے ان کی عمومی فکری سرشت کی بنا پر ہمیشہ ایسا کیوں لگا کہ جیسے وہ یہ بات دل کی گہرائیوں سے نہیں اوپر اوپر سے کہہ رہے ہیں۔ حمید شاہد کی شعری تنقید محض ادبی رواداری سے کہیں آگے فکشن اور شاعری میں تخلیقی وحدت کے علاقوں کا پتا دیتی ہے۔ قدرت نے اسے شعر کے اندر اترنے اور شعر کو اپنے اندر اتار لینے کے فطری ذوق سے نواز رکھا ہے۔ اسی لیے وہ اچھے شعر سے حظ اٹھانے کے ساتھ ساتھ اس پر وقیع نقد و نظر کی قابلِ رشک صلاحیت رکھتا ہے۔

اس خودنوشت میں دوسروں سے اپنے اختلاف کو برملا مگر خوش اسلوبی سے کہہ جانے کا سلیقہ بھی جگہ جگہ اپنی چھب دکھاتا ہے۔ اس نے کتاب میں کئی ایک معاصر و ممتاز نقادوں سے اپنے اختلاف کا بے باکانہ اظہار کیا ہے۔ اس حوالے سے اور بھی ذرا آگے نکل کر بات کرنے کی للک ایک زمانے میں اسے ادبی صحافت کے میدان میں بھی لے گئی اور اس نے ایک ہفت روزہ ادبی اخبار نکال مارا تھا۔ شکر ہے اس نے بہت جلد اس شور یلے بل کہ تخلیقی استعداد کے حق میں زہریلے علاقے سے واپسی کا فیصلہ کر لیا۔ مجھے یاد ہے ایک بار جب احمد فراز نے تشکیلِ پاکستان کے حوالے سے کوئی ناروا بات کہہ دی اور حمید شاہد نے میرا ردِعمل پوچھا تو میں نے کہا کہ

"فراز صاحب ہمارے انتہائی محبوب اور ہر دلعزیز شاعر ہیں وہ ادبی و تہذیبی معاملات میں اظہار رائے سے اجتناب ہی برتیں تو مناسب ہوگا۔"

مگر حمید شاہد نے میرے نام سے کچھ اس طرح کی سرخی جمادی کہ فراز صاحب فکری و تہذیبی موضوعات پر اظہار خیال سے باز رہیں۔ فراز صاحب کے جموروں نے فوراً ان کے کان بھرنے کی کوشش کی اور میں بھی ذرا گھبرا سا گیا۔ مگر جلد ہی گارڈن کالج کے ایک مشاعرے کی ملاقات میں فراز صاحب کی طرف سے کسی ردعمل سے محفوظ رہنے پر جان میں جان آئی۔

مجھے اس اعتبار سے حمید شاہد اور بھی اچھا لگتا ہے کہ وہ ایک سچے مومن کی طرح اخذ و اکتساب کے اعتبار سے ہر اچھی بات کو اپنی گمشدہ میراث سمجھنے کے باوجود خواہ مخواہ دوسری ادبی و تنقیدی روایات کی زائیدہ فکری و تنقیدی تھیوریز سے مرعوب نہیں ہوا رہتا۔ ناپ تول اور جانچ پرکھ کے ساتھ فیصلہ کرتا ہے کہ کہاں سے کیا اور کتنا لینا ہے کیا اور کتنا نہیں لینا۔ ان معاملات میں اپنے تحفظات کے حوالے سے کئی عالمی شہرت کے نظریہ سازوں سے اختلاف کے بعض نکات زیر نظر کتاب میں بھی درج ہو گئے ہیں۔ جیسے یوسا سے مکالمے والی کتاب کا ذکر وغیرہ۔

تاریخی اور سیاسی و سماجی حوالے

یہ کتاب ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ حمید شاہد طالب علمی کے زمانے سے ہی سیاست میں گہری دلچسپی رکھتا تھا۔ اس کی یہ دلچسپی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد بھی جاری رہی۔ وطن عزیز میں مارشل لاؤں کا نفاذ ہو کہ سیاسی تحریکوں کے موسم ہوں۔ سقوط ڈھاکہ کا گھاؤ ہو کہ اوجڑی کیمپ کا سانحہ۔ ایسے سب واقعات نے اس کے دل و دماغ میں جو ہلچل پیدا کی وہ کیسے اس کے کئی نمائندہ افسانوں کا حصہ ہو گئی، یہ تصنیف ان پہلوؤں کو بھی خوب صورت پیرائے میں نمایاں کرتی ہے۔ مگر یہاں مجھے حیرت ہوئی کہ اوجڑی کیمپ کے ذکر میں وہ پاکستانیوں کے مضبوط اعصاب اور اس سانحے سے نمٹنے میں دنیا بھر کو حیران کر دینے والے کارنامے کا تذکرہ کیسے بھول گیا۔ یہ وہ صورت حال تھی کہ امریکہ جیسے ترقی یافتہ ممالک ہمیں یہ مشورہ دے رہے تھے کہ اس انتہائی خطرناک حادثے سے نمٹنے کی خاطر چھ ماہ کے لیے راولپنڈی اسلام آباد کے جڑواں شہر خالی کروا لیے جائیں۔ مگر ہمارے ایک مذہبی جھکاؤ رکھنے والے جنرل ناصر نے اپنے افسروں

اور سپاہیوں کی قوتِ ایمانی کے بل پر انسانی ہاتھوں کے ذریعے کسی لمحے بھی پھٹ جانے والے تپتے ہوئے میزائلوں کو آبادی سے دور ٹھکانے لگا کر پوری دنیا کو یوں ششدر کر دیا کہ یہ آپریشن عالمی عسکری تربیت کے لیے نصابی دستاویز کی حیثیت اختیار کر گیا۔ اللہ ہمیں اپنی شاندار کامیابیوں پر بجا طور پر فخر کرنے کے شرحِ صدر سے سرفراز فرمائے۔

اس جملۂ معترضہ سے ہٹ کر عرض ہے کہ سیاسی و معاشرتی معروض کے رواں منظر نامے میں ہمارے محمد حمید شاہد کی یہ دلچسپی اپنی گہرائی میں اس کے تہذیبی سرکاروں سے رشتہ جوڑے ہوئے ہوتی ہے۔ اس کی اسلامیت تو اس کی پہلی تصنیف پیکرِ جمیل سے ہی اپنی تہذیبی پہچان کا اعلان کر چکی تھی۔ ادبی و فکری سفر میں کسی مرحلے پر بھی اس میں کوئی جھول پیدا نہیں ہوا۔ البتہ سقوطِ ڈھاکہ کا صدمہ والد صاحب کی طرف سے ورثے میں ملنے والی اس کی پاکستانیت کو شکستِ خواب کے سے حزن میں مبتلا کر گیا۔ اس کے گہرے اثرات اس کے ناول ''مٹی آدم کھاتی ہے'' پر نمایاں دکھائی دیتے ہیں۔ اس نے اس بہت بڑے المیے کو دو قومی نظریے کے لیے ایک غیر معمولی دھچکا تصور کیا۔ ناول کے اس زاویے پر میں اور افتخار عارف صاحب، ہم دونوں بہت بے مزہ ہوئے تھے۔ اور ہم نے حمید شاہد سے اس بارے شکایت ہی نہیں بحث بھی کی۔ وطنِ عزیز کے دونوں حصوں میں جس المناک طریقے سے علیحدگی ہوئی اور ہماری اجتماعی نفسیات پر جو تاریخی ملال چھوڑ گئی اس کے زیرِ اثر خود میرے اندر گریے اور گھٹن کا سلسلہ برسوں بعد تک جاری رہا۔ اس حزن و ملال کی شدت اپنی جگہ مگر نظریاتی اعتبار سے میں نے ہمیشہ یوں سوچا کہ ہم نے جب قرار دادِ پاکستان میں ایک آزاد ریاست کے بجائے آزاد ریاستوں کا مطالبہ کیا تھا تو ہندو پریس نے بھی کسی جگہ یہ سوال نہیں اٹھایا تھا کہ ایک سے زیادہ مسلمان ریاستوں کا مطالبہ کسی اعتبار دو قومی نظریے سے کوئی تضاد رکھتا ہے۔ گویا دشمن بھی دو قومی نظریے کی حقیقی معنویت وضاحت سے سمجھتا تھا کہ برِصغیر کے مسلمان چاہے جتنی ریاستیں بنالیں وہ ہندوؤں سے مختلف قوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن کر بھی ہندوؤں سے مختلف قوم رہا اور اس نے دو قومی نظریے کی روح سے انحراف نہیں کیا اور انگریزوں کے ساتھ ساتھ ہندو اکثریت سے آزادی کے فیصلے پر کبھی نظرِ ثانی کی ضرورت محسوس نہیں

کی- حتیٰ کہ اپنے ہم زبان مغربی بنگال کے ساتھ مل جانے یا اسے اپنے ساتھ ملا لینے کا بھی کبھی خیال تک نہیں آیا۔

گزشتہ کچھ برسوں سے حمید شاہد بطور ادیب کسی حالت میں بھی جنگ کے جواز کے حامی نہیں رہ گئے تھے۔ اس موضوع پر ہم وقتے وقتے سے بارہا بحث میں الجھتے رہتے تھے۔ ان کے خیال میں ایک فنکار کسی صورتِ حال میں بھی جنگ کی حمایت نہیں کرسکتا۔ میں اس پر زور دیتا کہ دانشورانہ نقطۂ نگاہ کے اعتبار سے بھی زندگی کی کلیت میں ظلم کے خلاف مزاحمت کے باب میں جنگ کا جواز ناگزیر ہو جاتا ہے۔ میں جب فلسطینیوں، مقبوضہ کشمیریوں اور بچاس ملکوں کے فوجی قبضے والے افغانیوں بارے سوال اٹھاتا کہ ان کے پاس تنگ آمد بجنگ آمد پر عمل کرنے کے سوا کیا چارہ کار ہے، تو بھی وہ جوازِ جنگ کی حمایت گوارا نہ فرماتے اور "میں اس سوال کا جواب دینا پسند نہیں کرتا" والی خوشی سے کام لیتے۔ وہ تو اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ ماضی قریب میں دنیا بھر پر اپنا تحمل آئینہ کردینے کے بعد جب ہم نے بھارتی غرور کو خاک چٹوا دی تو حمید شاہد صاحب کے لبوں سے بھی رزمیہ شبد ابلتے دیکھ کر ہماری تشویش دور ہوگئی۔

ہر تخلیق کار کا ایک اپنا الگ اور منفرد مثالیہ ہوتا ہے۔ ہم عام طور پر عمومی اشتراکات سامنے رکھ کر بہت سے فنکاروں کو ایک ہی نظریے کے لیبل والے ڈبے میں ڈال دیتے ہیں۔ ایسی نظریاتی جارحیت اصل تخلیق کار سے انصاف نہیں کرتی۔ کیونکہ کہ مجموعی طور پر کسی ایک نظریے سے ہم رشتہ ہونے کے باوجود شعوری و لاشعوری طور پر وہ اس کا مکمل مکلف نہیں ہوتا۔ ہم اس خاص نظریے کے حوالے سے اس کے بعض تحفظات یا اس میں اس کی اپنی پسند کے کچھ عناصر کی شمولیت کی خواہش سے صرفِ نظر کر کے اسے پہلے سے موجود کسی خاص نظریے کا ایک نمائندہ فنکار ٹھہرا کر مہر بند کر دیتے ہیں۔ ہمیں صرف اسلوبی عناصر ہی میں ایک صاحبِ قلم کی انفرادیت تلاشنی اور متعین نہیں کرنی چاہیے۔ بلکہ اس کیا پنے فکر و احساس کو زیادہ باریک بینی سے دیکھ اور جانچ کر اس کی منفرد اپروچ کی نشان دہی کی سعی بھی کرنی چاہیے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ

"خوشبو کی دیوار کے پیچھے" ایک ایسی دستاویز ہے جو حمید شاہد کے جملہ فکری و فنی عناصر سے بننے والی ایک منفرد کلیت تک رسائی کے لیے ہمیشہ ایک اہم اور بنیادی حوالے کا کردار ادا کرتی رہے گی۔

☆☆☆☆☆

سیّد حُبدار قائم کی ''صبحِ نعت'' پر ایک عقیدتی نظر

ضلع اٹک کی تحصیل غریب وال سے تعلق رکھنے والے سید حُبدار قائم کی دلدار شخصیت سے اب تک میری ایک ہی ملاقات ہوئی ہے مگر وہ نثر و نظم کے اظہاری حوالے سے حمد و نعت اور دوسری اصناف سے یوں جڑے ہوئے ہیں کہ ان کی شخصیت میں دلداری اور دلنوازی پیدا ہو جانا لازمی تھا۔ ان کا زیرِ نظر نعتیہ مجموعہ ''صبحِ نعت'' ۲۰۲۴ء میں شائع ہوا تھا جبکہ اس سے پہلے ''مدحِ شاہِ زمن'' کے عنوان سے ان کا پہلا نعتیہ مجموعہ شائع ہو چکا تھا۔ ان کے تخلیقی وفور کا یہ عالم ہے کہ اسی سال ان کا تیسرا نعتیہ مجموعہ ''روحِ جمال'' کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے، اردو کے ساتھ ساتھ ان کا تخلیقی بہاؤ پنجابی زبان میں بھی دریا کی سی روانی سے رواں دواں ہے نظم و نثر میں نمازِ شب، اکھیاں وچ زمانے کے علاوہ انتقادات و تاثرات کے عنوان سے نعتیہ کتابوں پر تبصرے اور ارتسامِ خیال کے عنوان سے دوسری کتب پر ان کے تبصرے کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔ مجھے ان کی آخری کتاب کے سوا تقریباً سبھی کتابوں کے مطالعے کا شرف حاصل ہو چکا ہے جس میں سے ''مدحِ شاہِ زمن'' پر میں اپنے تاثرات لکھنے کا شرف بھی حاصل کر چکا ہوں، گویا بلا شبہ میں اُن کی تخلیقی ہنر کاری اور عقیدتی سرشاری کا قائل اور معترف ہوں۔

معروف نعت گو شاعر اور نقاد سید ابرار حسین فرماتے ہیں کہ نعتیہ شاعری کے تین نمایاں پہلو ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ اس ذاتِ اقدسؐ کا تقدیسانہ ذکر کر کے دلوں میں اس کی محبت کو راسخ کیا جائے، دوسرے انؐ کی سیرت کے مختلف پہلو اجاگر کر کے لوگوں کو ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی ترغیب دی جائے اور تیسرا یہ کہ اپنے ذوق و عقیدت و شوق کا اظہار کر کے اسے ذخیرۂ آخرت بنایا جائے۔ اس پیمانے پر جب سید حبدار قائم کے نعتیہ کلام کا جائزہ لیا جائے تو یہ خوشگوار احساس ہوتا ہے کہ اس میں یہ تینوں اہم پہلو گھل مل کر اشعار کی صورت میں عمدگی کے ساتھ اپنا اظہار کر رہے ہیں۔ ان کے چند نعتیہ اشعار اس دعوے کی دلالت کے طور پر ملاحظہ ہوں:

جس طرف دیکھا نظر آیا ہے جلوہ اُنؐ کا
پیدا آثار جو ہر بار ہوئے، خوب ہوئے

یہ جلترنگ، یہ بلبل، یہ تتلیاں ساری
یہاں کوئی نہ اڑاتا بصورتِ دیگر

کونین ہو گئی ہے منوّر جو نور سے
کیا خوب ہیں عطائیں لقد جاءکم رسولؐ

نسیمِ سحر

ماں جی سے یہ سنا ہے، صحیفے ہوں یا کتاب
قرآن بھی رقم ہے محمدؐ کی شان میں

میں پھونک مار دوں تو شفایاب ہو مریض
قائم کی مدحتوں کا اثر ہے زبان میں

ان سب کو ہدایت میرے آقا ہے ضروری
عشرت نے سلاطین کو بے کار کیا ہے

وہاں قائم اجالا بھی زمانے سے نرالا تر
جہاں حسانؓ جیسا اک سخنور بھی سوالی ہے

....

ان کی نعت گوئی کا نمایاں پہلو یہ ہے کہ وہ سلیس اور عام فہم انداز میں روانی کے ساتھ نعتیں کہتے ہیں اور سہلِ ممتنع کی اس خوبی کے ساتھ قاری یا سامع پر ان کے کلام کا فوری ابلاغ ہو جاتا ہے۔ جب میں نے اس سلاست اور روانی کے اوصاف پر غور کیا تو محسوس ہوا کہ انھوں نے اساتذۂ کرام کے تقدیسی کلام کا گہرا مطالعہ کیا ہوا ہے اور یہ راز پا لیا ہے کہ مشکل پسندی اختیار کر کے شاعر کسی اور کا نہیں، اپنا ہی نقصان کرتا ہے کہ اس کا دائرۂ ابلاغ محدود ہو جاتا ہے۔ سیّد خُبدار قائم کو اس مطالعے سے یہ استفادہ بھی ہوا کہ انھوں نے اپنی سخن وری کے وصف کے تحت اساتذۂ کرام کے ساتھ ساتھ عہدِ حاضر کے نعت گو شعراء کی زمینوں میں بھی طرحی نعتیں کہیں، جو ان کی شعری ریاضت کی مظہر ہیں۔ عموماً کوئی شاعر جب کسی کی زمین میں طرحی نعت یا غزل کہتا ہے تو وہ اس شاعر کے موضوعات اور لفظیات کے دائرے کا اسیر بھی ہو جاتا ہے مگر خُبدار قائم نے متعلقہ شاعر کی صرف طرحی زمین لے کر اس میں اپنی ہی تخلیقی ہنر کاری کے انفراد کے ساتھ گل بوٹے اگائے ہیں۔ چند اشعار اس حوالے سے دیکھیے:

لے کے آئے ہیں جو اپنے رب کا کلام
اس مثالی ہدایت پہ لاکھوں سلام

مجھ کو سالارِ نعت مت کہنا
میں سپاہی عبا میں رہتا ہوں

درِ رسولؐ پہ جاروب کش بنو قائم
کہ نورِ دل کے لیے چاکری ضروری ہے

نبیؐ تو اور بھی گزرے مگر تطہیر کا خاصا
کسی کی آل کی عترت میں آیا ہے نہ آئے گا

جہاں جبریل رکتا تھا وہاں بڑھتے گئے آگے
کوئی جبریل سا حیرت میں آیا ہے نہ آئے گا

کردار کا جو شخص محافظ نہیں بنا
وہ شخص مدینے کا سزاوار نہیں ہے

مردہ دل مدحتِ سرکارؐ سے بیزار مگر
زندہ دل کی یہ کمائی ہے کہ سبحان اللہ

....

سیّد خُبدار قائم نے معجزاتِ رسولؐ کا ذکر اور تاریخی اور اسلامی طور پر مستند واقعات کو بھی

حمدو اسلوب میں اور بامعنی تلازموں، تشبیہات و استعارات میں شعروں میں یوں سمیٹا ہے:

پھر سے جوڑا کر کے ٹکڑے اک اشارے سے قمر
آسماں پر وہ ستاروں میں قمر ہے محترم

اک سواری شبِ معراج فلک سے اتری
وہ نشاں دیکھ، ستاروں میں عیاں باقی ہے

آلِ رسولؐ اور اہلِ بیت اطہار کا ذکر، اور کربلا کے حوالے بھی ان کی نعتوں میں موجود ہیں کہ وہ خود بھی اہلِ سادات سے نسبت رکھتے ہیں:

کانپا تھا حرملا بھی اٹھا کر کمان کو
معصوم پر جو تڑپے وہ ہائے حسینؑ تھے

جو مشکل میں مشکل کشا ہے نبیؐ کی
وہ قائم جہاں سے بریں فاطمہ ہے

اسی طرح صحابۂ کرام اور ان کے عشقِ رسولؐ کا ذکرِ مبارک اور رسالت مآب کی تعلیمات کے حوالے سے ان کا کردار بھی حیدار قائم کے تقدیسی کلام کا حصہ ہے۔ ان کے کئی اشعار اس حوالے سے دیئے جا سکتے ہیں مگر مضمون کی طوالت سے گریز کے سبب نہیں دیئے جا رہے۔

ایک سو ساٹھ صفحات کی ضخامت کے ساتھ "صبحِ نعت" میں ایک حمد، اڑسٹھ نعتیں اور چھ مناقب و سلام سید حیدار قائم کی حب رسولؐ اور اہلِ بیتِ اطہار سے دلی وابستگی کا شاندار تقدیسی و عقیدتی اظہار کر رہی ہیں۔

ان کے استادِ گرامی حضرت گوہر رحمان گہر مردانوی اپنی تقریظ میں کیا خوب لکھتے ہیں:

"سخن سازی اور منظوم اصنافِ سخن میں حمد و نعت اور مناقب و مرثیہ جات لکھنا کارِ مشکل ہے کیونکہ اگر دینی علوم سے واقفیت کے ساتھ ساتھ عمل نہ ہو تو ان اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کرنا آسان نہیں۔ سید حیدار قائم کو اگر الفاظ کے آئینے میں پرکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ صاحبِ کلام کو ان اصنافِ سخن پر قدرتِ کلام اس لیے بھی حاصل ہے کہ وہ دینِ محمدیؐ پر پوری طرح عمل پیرا ہیں۔ خاکسار نے بھی جہاں کہیں اسے دیکھا تو بارگاہِ ربّ العزت میں سربسجود دیکھا"۔ اس اظہاریے کو میں اس اعتراف کے ساتھ تمام کرنا چاہتا ہوں کہ تاحال تو ضلع اٹک نعت گوئی کی نسبت سے جناب شاکر القادری، ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد، اور جناب اعجاز حسین ساحر جیسے نعت گو شعراء کے اسمائے گرامی سے اپنی واضح پہچان رکھتا ہے، لیکن وہ وقت زیادہ دور نہیں جب سیّد حیدار قائم کا نام بھی ضلع اٹک کی بالخصوص اور پورے پاکستان کی بالعموم پہچان بن جائے گا کہ ان کے عقیدتی و تقدیسی کلام کی پختگی اور تخلیقی زرخیزی کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے یہ امکانات روشن و تابندہ دکھائی دے رہے ہیں۔ یہی میری دُعا بھی ہے اور تمنا بھی۔ وما علینا الا البلاغ۔

☆☆☆☆☆

عذرا اصغر کا افسانوی شعور .... ''پھول جھڑتے رہے'' کے تناظر میں

طالب انصاری

عذرا اصغر صاحبہ اس عہد سے تعلق رکھتی ہیں، جب بیشتر پڑھے لکھے گھروں میں ادبی رسائل شوق سے پڑھے جاتے تھے۔ کم سے کم اردو ڈائجسٹ تو ہر چھوٹے بڑے کے مطالعہ میں ضرور رہتا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کتاب بینی صرف مشغلہ نہیں، بل کہ علم افروز سرگرمی سمجھا جاتا تھا۔ اردو ڈائجسٹ میں اخلاق سدھار کہانیوں کو ترجیحی بنیادوں پر شائع کیا جاتا تھا۔ اسی زمانے میں مکتوب نویسی کا بھی چلن تھا۔ احباب ایک دوسرے کو خطوط لکھا کرتے تھے اور ان میں بعض خطوط انشاء پردازی کا شاہ کار ہوا کرتے تھے۔ بہترین لکھائی اور عمدہ جملہ سازی کا بالخصوص اہتمام کیا جاتا تھا۔ یوں ہم اس دور کو ایک ادبی دور کہہ سکتے ہیں، جب اردو ادب کے مشاہیر بھی زندہ تھے اور ادبی رسائل بھی تواتر سے شائع ہوا کرتے تھے۔ سیپ، نقوش، سویرا، ادب لطیف، افکار، فنون ایسے شان دار رسائل تشنگان علم و ادب کی پیاس بجھاتے تھے اور ان رسائل میں اردو کے بھارتی مصنفین کی تخلیقات بھی شامل اشاعت ہوتی تھیں۔

قیام پاکستان کے فوراً بعد پاکستان میں اردو ادب ایک انتہائی اہم دور سے گزر رہا تھا۔ یہ دور تقسیم ہند کے بعد کا ابتدائی زمانہ تھا، جس میں نئے ملک میں نئی معاشرتی الجھنوں نے اردو ادب کو گہرا متاثر کیا۔ کئی ادیبوں نے تقسیم کے دکھ اور ہجرت کے المیوں پر مشتمل افسانے اور ناول لکھے، سعادت حسن منٹو، احمد ندیم قاسمی، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، اور عصمت چغتائی اس ضمن میں نمایاں ہیں۔ ہجرت کے المیوں پر مشتمل افسانوں نے اردو ادب کو خوب ثروت مند کیا۔ بعد ازاں ترقی پسند تحریک اردو ادب پر غالب آئی۔ لگ بھگ پچاس، پچپن برس پیشتر پاکستان میں ادب ایک متحرک اور متنوع دور سے گزر رہا تھا۔ اس دور کا ادب سیاسی، سماجی اور نظریاتی اعتبار سے نہایت اہم تھا۔ اردو ادب پر ترقی پسند تحریک کا نمایاں اثر تھا۔ ترقی پسند تحریک اگرچہ 1936

میں شروع ہوئی تھی لیکن 1970 کی دہائی تک اس کا اثر کم ہوتے ہوئے بھی موجود تھا۔ ادب میں طبقاتی جدوجہد اور استحصال کے خلاف آواز اٹھانا اور عام انسان کے مسائل کو زیرِ قلم لانا بہت اہم تھا۔ اس کے بعد جنرل ضیا الحق کے مارشل لاء سے جو سیاسی عدم استحکام پیدا ہوا، اس نے بھی ادیبوں کو متاثر کیا اور انھیں اس سیاسی جبر کے خلاف لکھنے پر مجبور کیا۔ یہی وہ دور تھا، جب افسانہ اور ناول میں نئے اسالیب پر تجربات ہو رہے تھے۔ انور سجاد، انتظار حسین، مظہر الاسلام، رشید امجد وغیرہ نے علامتی اور تجریدی اسلوب میں اہم کام کیا۔ یوں قیام پاکستان سے لے کر آج تک اردو افسانہ موضوعات اور انداز بیان کے اعتبار سے نئی سے نئی تبدیلیوں سے آشنا ہوتا رہا ہے۔

عذرا اصغر صاحبہ نے اردو ادب کے بدلتے ہوئے یہ تمام ادوار دیکھے اور ان میں لکھا گیا ادب پڑھا بھی۔ اس سارے تناظر میں اگر ہم عذرا اصغر صاحبہ کے افسانوی شعور کا جائزہ لیں تو پتا چلے گا کہ ان کے ہاں ترقی پسند تحریک کے زیر اثر اسلوب کو قبول کرنے کا رجحان تو نہیں ہے۔ مگر غیر شعوری طور پر اس کے اثرات کہیں کہیں زیریں سطح پر موجود ہیں۔ ان کی کہانیاں ہمارے معاشرے کے مسائل کا آئینہ ہیں اور یہ مسائل عام طور پر طبقاتی معاشرے میں خوب پنپتے ہیں۔ متوسط اور غریب طبقے سے لے کر خوش حال طبقے تک کے مسائل کو انھوں نے اپنی کہانیوں میں جگہ دی ہے۔ ان کی کہانیاں روزمرہ زندگی کی جھلکیاں ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ عورت کے سماجی و عائلی مسائل نے ان کے افسانوں میں نمایاں جگہ بنائی ہے۔

عذرا اصغر صاحبہ تجریدیت اور علامتی اسلوب سے بھی متاثر نہ ہوئیں۔ ان کے ہاں افسانہ لکھنے کا انداز کہانی سنانے کا انداز ہے۔ اس اسلوب کو ہم سادگی، روانی اور بے ساختگی سے تعبیر کر سکتے ہیں ان کے افسانے پڑھتے ہوئے یوں لگتا ہے، جیسے کوئی سامنے بیٹھا ہوا کہانی سنا رہا ہو۔ عذرا اصغر صاحبہ معاشرے میں پھیلی بے شمار تلخیوں سے مٹھاس نچوڑنے کا کام لیتی ہیں۔ اس لیے ان کے ہاں پھولوں اور پودوں سے محبت طبعی میلان کی حیثیت سے ہر وقت موجود ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ پھولوں کے ساتھ کانٹے بھی ہوتے ہیں۔ مگر ایک رجائیت پسند تخلیق کار کانٹوں سے صرفِ نظر کرتا ہے۔ ان کی تحریروں میں دانستہ و نادانستہ پیڑوں، پھولوں اور تتلیوں کا ذکر ضرور آ جاتا ہے۔

عذرا اصغر کے ہاں یاد آفرینی بھی ایک غالب عنصر کے طور پر موجود ہے۔ ایک فن کار کا المیہ یہ بھی ہے کہ ماضی اس کی پناہ گاہ ہوتا ہے۔ اور ایک عمر رسیدہ تخلیق کار کے لیے تو اس کا بہترین ساتھی ماضی ہی ہوتا ہے۔ عمر رسیدگی کا ایسا عالم، جب بہت سے ساتھی بچھڑ چکے ہوں

اور انسان نئی نسل کے عہد کے تقاضوں کا ساتھ دینے سے معذور ہو۔ بل کہ ان کے ساتھ گھسٹ گھسٹ کر چل رہا ہو، ایک فن کار کو تنہا کر دیتا ہے اور اگر جیون ساتھی بھی بچھڑ جائے تو یہ تنہائی بہت جاں گسل ہو جاتی ہے۔ ایسے میں ہر حساس فن کار اپنے ماضی کی پٹاری کھولتا ہے اور اس میں رکھی یادیں پھرولتا رہتا ہے۔ عذرا اصغر بھی عمر کے لمبے سفر میں تنہائی کو ہاتھ تھامے چل رہی ہیں۔ اسی لیے ان کی بیشتر کہانیاں یادوں پر مشتمل ہیں۔ مگر یہ کہانیاں صرف کسی واقعہ تک محدود نہیں رہتیں، ان کا دائرہ وسعت آشنا ہو کر کہانی میں چھپی معنویت کو بھی ظاہر کرنے لگتا ہے۔

عذرا اصغر صاحبہ کے ہاں رومانویت نے بھی نمایاں جگہ بنائی ہے۔ یہ رومان پر مبنی افسانوں کی بنت کسی نظم کی طرح کرتی ہیں، جس کی آخری سطریں پوری نظم کی جان ہوتی ہیں۔ اسی طرح عذرا صاحبہ کے رومانوی افسانوں کی آخری سطریں بھی افسانے کو جذباتی سطح پر مقامِ بلند پر لا بٹھاتی ہیں۔ عذرا اصغر صاحبہ نے تقسیم ہندوستان کے وقت ہجرت کے المیوں کا صرف مشاہدہ نہیں کیا، تجربہ بھی کیا ہے۔ اس لیے ان افسانوں میں ماضی کے شہر، رسوم و رواج زندہ کرداروں کی طرح سامنے آتے ہیں۔ بسا مقامات پر ان کی تحریروں میں گم شدہ تہذیب کا نوحہ بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ ان کے ذہن میں جو خیالات گھنگھور گھٹاؤں کی طرح امڈتے ہیں اور ان خیالات کی تابڑ توڑ بارش کے تحت دماغ میں جو طوفان پیدا ہوتا ہے، اسے رم جھم کی صورت میں قرطاس پر بکھیر دیتی ہیں۔

عذرا اصغر صاحبہ کے مذکورہ بالا اختصاص کے ساتھ اگر ہم ان کی نئی تصنیف ''پھول جھڑتے رہے'' کا محاکمہ کریں تو سب سے پہلے کتاب کا عنوان قاری کو متوجہ کرتا ہے۔ یہ نام بظاہر فصلِ خزاں کا عندیہ دیتا محسوس ہوتا ہے۔ مگر عذرا اصغر صاحبہ کے ہاں یاد آفرینی کے رجحان کو اگر ذہن میں رکھا جائے تو اس عنوان کی معنویت، کتاب پڑھے بغیر ہی واضح ہونے لگتی ہے۔ ان کے دیکھتے ہی دیکھتے کتنے ہی پھول شاخِ ہستی سے جدا ہو کر دارِ بقا کی طرف چلے گئے۔ یہ عنوان اجل کی ہوائے تند و تیز کی علامت بھی تو ہو سکتا ہے۔ اسی عنوان کا افسانہ، جو صفحہ 103 پر شاملِ کتاب ہے، عذرا اصغر صاحبہ کے رومانوی اور یاد آفرینی کے اسلوب کی بہترین مثال ہے۔ اس افسانے میں آڑو کے ایک پیڑ کا کٹنا، موت کے المیے کو بھی بیان کر رہا ہے۔ افسانے کی ہیروئین کا بسترِ مرگ پر ہونا اور آڑو کے اس پیڑ کا کٹنا، جس سے افسانے کی ہیروئین بے حد محبت کرتی ہے،، بہترین تمثیلی پیرایہ ہے۔ یہی عذرا اصغر کا کمال ہے کہ وہ رومانوی افسانوں کی بنت کاری میں کیف و احساس کا ایسا رنگ بھر دیتی ہیں کہ قاری دم بخود سا رہ

جاتا ہے، جیسے ہم کوئی اچھی نظم پڑھ کر کتاب کو الٹا رکھ دیتے ہیں اور نظم کی وسعتوں میں کھو جاتے ہیں۔ میرے نزدیک، ان کا یہ افسانہ تخیل اور بنت کاری کے حوالے سے ایک نظم کی طرح ہے۔ مزید افسانوں کی جہات مقرر کرنے سے پہلے کتاب کے انتساب پر بھی غور ضروری ہے۔ کتاب کا انتساب المہدی کے نام ہے، جو کبھی مصنفہ کا آشیانہ ہوا کرتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اب وہ آشیانہ ان کا نہیں رہا ہے۔ اپنی کتاب کو بچھڑے ہوئے آشیانے سے معنون کرنا یاد آفرینی کی ایسی مثال ہے، جس کا فقدان اگر نہ سہی تو کم کم ضرور ہے۔

اگر ہم کتاب میں شامل افسانوں کو موضوعاتی سطح پر دیکھیں تو ہمیں پانچ قسم کے موضوعات تواتر کے ساتھ دکھائی دیں گے۔ ان میں یاد آفرینی، احساس و کیفیت، معاشرتی مسائل، موقع پرستی اور رومان نمایاں ہیں۔ اگرچہ بیچ میں کچھ موضوعات ان سے ہٹ کر بھی ہیں۔ مثال کے طور پر حکم رانوں کی عیاشیاں، نفسیاتی مسائل، ملک کی بگڑتی ہوئی سیاسی و معاشی صورت حال۔ عذرا اصغر ان تمام موضوعات کو قرینے سے نبھانے میں کام یاب ہوئی ہیں۔ یہ قرینہ اس احساس کی دین ہے، جو انھیں قدرت نے عطا کیا ہے۔

''خوگرِ حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے'' کی ذیل میں اک عرض داشت یوں ہے کہ کتاب میں مختصر افسانوں اور افسانچوں کو الگ الگ نہیں کیا گیا۔ بہتر تھا اگر افسانچوں کو کتاب کے آخر میں افسانچے کا عنوان دے کر شائع کیا جاتا۔ یہ کوئی ایسا عیب تو نہیں ہے، جو بہت زیادہ قابلِ توجہ ہے۔ البتہ میری دانست میں اس ترتیب سے کتاب کا حسن نکھر جاتا۔ کئی جگہوں پر املا کی غلطیوں نے بھی کتاب کے متن مواد کو متاثر کیا۔ ان میں سے بعض کتابت کی غلطیاں ہیں اور کچھ مصنفہ سے سہواً سرزد ہوئی ہیں۔ میں اصلاح کے لیے نشان دہی ضروری سمجھتا ہوں، تاکہ اگلی اشاعت میں ان غلطیوں کو درست کر لیا جائے۔

خصیص غلط خسیس درست - جکاکشی غلط جفاکشی صحیح - اثیر غلط اسیر صحیح - ممانیت غلط ممانعت صحیح - مضارعین غلط مزارعین صحیح - استداد غلط، استعداد صحیح۔ آعلیٰ غلط، اعلیٰ صحیح۔ قوس قزاح غلط، قوسِ قزح صحیح - مرحم غلط، مرہم صحیح - علوالعزم غلط، اولوالعزم صحیح - جانسوزی غلط، جاں سوزی صحیح۔ گلی کونچوں غلط، گلی کوچوں صحیح امید کی جانی چاہیے کہ کتاب کی اگلی اشاعت پر یہ اغلاط درست کر لی جائیں گی۔ میں افسانوں کی اس کتاب کو اس لیے عذرا اصغر کی نمائندہ کتاب کہوں گا کہ اس میں ان تمام موضوعات پر مبنی افسانے شامل ہیں، جو ان کے افسانوی اسلوب کی جہت متعین کرتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

شہر کے دوسرے کنارے سے

احمد حسین مجاہد عصرِ حاضر کے قومی شعری منظرنامے میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری کا سفر اسّی کی دہائی میں شروع ہوا۔ آج وہ نصف صدی کے سنگ میل پر کھڑے ہیں۔ ''دھند میں لپٹا جنگل'' اور ''اوک میں آگ'' سے ہوتے ہوئے اب وہ ''شہر کے دوسرے کنارے'' سے آواز دے رہے ہیں۔

شاعری کے اس طویل اور تھکا دینے والے سفر میں صرف تین شعری مجموعے اس بات کے عکاس ہیں کہ ان کے ہاں مقدار سے زیادہ معیار اہم ہے اور یہ معیار ہی نہ صرف ان کے ہاں نظر آتا ہے بل کہ ہر اُس قاری پر دیرپا اثرات چھوڑتا چلا جاتا ہے جو اعلیٰ پائے کی شاعری کا متلاشی رہتا ہے۔ ہمارے دیس میں بے تحاشا شاعری ہو رہی ہے۔ ہر سال بے شمار شعری مجموعے منظرِ عام پر آتے ہیں، لیکن کوئی تاثر چھوڑے بغیر وقت کے گرد و غبار میں تحلیل ہو جاتے ہیں۔ بعض شعرا کی شعری تخلیقات درجنوں میں ہیں۔

احمد حسین مجاہد کو زیادہ شعری مجموعے منظرِ عام پر لانے کی فکر نہیں، اور ہونی بھی نہیں چاہیے۔ کیوں کہ انھوں نے غزل اور نظم میں جتنا کام کر کے اپنی کتابوں میں محفوظ کرلیا ہے وہ انھیں تادیر زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔ وہ غزل اور نظم دونوں پر دستگاہ رکھتے ہیں انھوں نے ان دونوں میں توازن رکھا ہوا ہے۔ اس ہنگامہ خیز دور میں شاعر کم ہی نظر آتے ہیں۔ اکثر کی نظمیں عموماً سر کے اوپر سے گزر جاتی ہیں۔ لیکن ان کی نظمیں کسی نہ کسی اچھوتے موضوع کا احاطہ کرتی ہیں۔

وہ خیال کو عمدہ الفاظ کا جامہ پہناتے ہیں، الفاظ وتراکیب کا احتیاط سے استعمال کرتے ہیں، اور اپنے مافی الضمیر کو نہایت نفاست سے نظم میں اتار دیتے ہیں۔ ان کی ایک نظم مسافر خواہشیں

ہارون الرشید

اپنے اندر گہرا تاثر رکھتی ہیں - چند چھوٹے چھوٹے مصرعوں پر مشتمل اس نظم پر رائیگانی کے سالوں کی ایک دبیز تہہ جمی ہوئی ہے- اس میں ایک کہانی ہے، ایک ایسی کہانی جو ہر آدمی کا مقدر ہے- اس کا انت دکھ اور درد کی ایک لمبی لکیر کھینچتا ہوا بہت پیچھے رہ جاتا ہے:

لہلہاتے کھیت سے
نظموں کے خوشے چنتے چنتے
شام گہری ہو گئی ہے
دور افق پر خامشی کے
پیڑ کی رنگت سنہری ہو گئی ہے

....

''شہر کے دوسرے کنارے سے'' کے اوراق الٹتے ہوئے ایک نظم ''میں'' آگے آتی ہے، یہ دنیا کے اندر طاقت وروں کے کمزوروں کے بہائے جانے والے خون ناحق کے چھینٹوں سے بھیگی ہوئی ہے- اس میں بڈگام، فلسطین، بغداد، روہنگیا، کابل اور آرمی پبلک سکول پشاور کے پس منظر میں جھلکتا ہوا کرب روح کو جھنجھوڑ کے رکھ دیتا ہے-

میرا نام ایلان کردی رہا ہے
مگر اب مرے سینکڑوں نام ہیں،
میں فلسطین کا مصطفیٰ ہوں
پشاور کا گل شیر ہوں
میں نے بڈگام میں جان دی تھی
میری قبر بغداد میں ہے

....

''بھونرا'' بھی ان کی مختصر سی نظم ہے- اس کا مفہوم زندگی کی بے ثباتی سے عبارت ہے- اس کے آخری مصرعے کتنے وسیع و بلیغ ہیں:

اندازوں کے تیر چلائے
اڑتا جائے
دائیں بائیں ٹھوکر کھائے
چلتے پنکھے سے ٹکرائے
کوڑے کرکٹ میں رل جائے

....

''شہر کے دوسرے کنارے سے'' میں ان کی محض بارہ نظمیں ہیں-

غزل ہماری اردو شاعری کا جھومر ہے- احمد حسین مجاہد نے جس طرح نظموں کی بنت اور تزئین و آرائش پر توانائیاں صرف کی ہیں، اسی طرح لیلائے غزل کے گیسو سنوارنے میں بھی بہت وقت صرف کیا ہے- اس مجموعے میں ان کی چونتیس غزلیں ہیں- ان کی غزلوں کے ایک ایک شعر کا ایک مصرعہ بھی بناتے ہوئے وہ الفاظ و تراکیب کے درست استعمال کا بہت دھیان رکھتے ہیں- زبان کی تقدیس اور حرمت کا پاس ان کے ہاں بدرجہ اتم نظر آتا ہے-

آج کے بے ہنگم دور میں اردو زبان اور شاعری کے ساتھ جو کھلواڑ ہو رہا ہے اسے ہر وہ شخص بڑے رنج سے دیکھتا اور محسوس کرتا ہے جسے اپنی قومی زبان کی عظمت اور مرتبے کا احساس ہے وہ ایسے ستھرے اور سنجیدہ کلام کے مطالعے سے تسکین اور سرشاری حاصل کرتا ہے- اس جہان بے ثبات میں کوئی آرزو

ہو کے شورش ہائے ہو، موج کی جستجو ہو کے قطرہ کی آبرو، سارا چمکار فراق پہ جا کے ختم ہوتا ہے۔ ان کی غزل میں گل ہائے رنگ کی دیدہ زیبی بھی ہے، ہجر و فراق بھی، ٹوٹے ہوئے خوابوں کی کرچیاں بھی ہیں، اور عمر کی رائیگانی کا غم بھی ہے اور ناقدری عالم کا شکوہ بھی:

میں کیا بتاؤں گا تاخیر کا سبب اس کو
لیا نہیں ہے کہیں راستے میں دم میں نے

میں یہاں آخری مسافر ہوں
اک نظر ، دیکھ لوں سرائے کو

اسی لیے تو یہ بستی ہے نامراد بہت
کسی کے کام کوئی وقت پر نہیں آیا

پہلے مجھ سے دیر تک اٹھکیلیاں کرتی رہی
چل پڑی پھر راہ کی دیوار میرے ساتھ ہی

ضرور آئے گا اس دشتِ تیرگی میں کوئی
سنائی دیتی ہے مجھ کو کسی چراغ کی چاپ

پھرے نہ شعر کی تاثیر سے بھی جن کے قلوب
دکھاؤں ان کو میں کیا اور معجزہ کر کے

سب ختم ہو گیا مری وحشت نہیں گئی
مڑ مڑ کے دیکھنے کی یہ عادت نہیں گئی

یہ شعورِ رنگ و بُو جس نے دیا ہے
میں وہی جاتی خزاں تھا اب نہیں ہوں

....

دو ہزار پانچ کے قیامت خیز زلزلے کو اب بیس سال ہونے کو آتے ہیں۔ اس زلزلے کا ذکر آئے تو اسے نہ وہ بھول سکتے ہیں اور نہ میں فراموش کر سکتا ہوں۔ اس کے المناک اور روح فرسا مناظر کی تصاویر ہر اس شخص کے لاشعور کے نہاں خانوں میں محفوظ ہیں، جو اس سے براہ راست متاثر ہوا۔

احمد حسین مجاہد نے بھی اپنی شاعری میں زلزلے کے کئی ناظر محفوظ کر دیے ہیں۔ ان کے پہلے شعری مجموعے ''دھند میں لپٹا جنگل'' کا انتساب سفیر احمد نعمانی کے نام ہے، یہ ان کے بچپن کے گہرے دوست تھے جو زلزلے میں شہید ہوئے۔ یہ مجموعہ کلام زلزلے سے کئی برس پہلے منظر عام پر آیا تھا۔ ان کے دوسرے مجموعے ''اوک کی آگ'' میں اس دوست کا ذکر موجود ہے، اور اب ''شہر کے کنارے سے'' میں بھی انھوں نے ایک نظم ''سفیر احمد نعمانی کی یاد میں'' کے عنوان سے لکھی ہے، جس کے درد بھرے اشعار دل کو رنجیدہ کر دیتے ہیں:

مگر وہ تھا ہی نہیں اس لیے نہیں بولا
میں چیختا رہا مجھ کو پکار میرے یار
کسے خبر تھی کہ میرے وہاں پہنچنے تک
تو اوڑھ لے گا یہ گرد و غبار میرے یار

....

احمد حسین مجاہد کے فن میں اور کیا ممکنہ امکانات ہیں، یہ دیکھنا ہے۔ ان کا اگلا شعری مجموعہ کتنی مدت بعد تشکیل پاتا ہے اس کا انتظار رہے گا۔ انھوں نے آئندہ کے متعلق اس کتاب میں اشارہ کر دیا ہے۔

الجھا ہوا دن ہو کہ سلگتی ہوئی شب ہو
جو تیری مشیت ہے وہی میری طلب ہو

☆☆☆☆☆

......بحرین کی یادیں اور سعید قیس کی شاعری......

علی رضا

تابش گنبد خضرا ہے مرے سینے میں
اک عجب نور کا دریا ہے مرے سینے میں

خواب غفلت میں کھلی رہتی ہیں آنکھیں میری
دل مرا جاگتا رہتا ہے مرے سینے میں

روشنی آپ کے اوصاف بیاں کرتی ہے
اک دیا شام کو جلتا ہے مرے سینے میں

درد کس زعم سے اٹھتا ہے مرے دل کے قریب
زخم کس شان سے پلتا ہے مرے سینے میں

روز چلتی ہیں عقیدت کی ہوائیں مجھ میں
ایک چھوٹا سا دریچہ ہے مرے سینے میں

سوچتا ہوں تو بہت دور ہے منزل میری
دیکھتا ہوں تو مدینہ ہے مرے سینے میں

اک کرن جھانکتی رہتی ہے دریچے سے مجھے
اک عجب رنگ تماشا ہے مرے سینے میں

....

قیس یہ نور تصور ہے کہ چہرہ اُن کا
روز اک چاند اترتا ہے مرے سینے میں

مندرجہ بالا نعت وہ حوالہ ہے جو میری جناب سعید قیس سے ملاقات کا سبب بنا...... یہ غالباً نومبر 2003 کے ابتدائی دنوں کی بات ہے جب پاکستان کلب بحرین کے زیر اہتمام ہونے والی ایک محفل حمد و نعت میں شمولیت کے لیے مجھے دعوت نامہ موصول ہوا میرے علاوہ پاکستان سے اس پروگرام میں معروف نعت خواں اور شاعر محمد اکرم قلندری بھی شریک ہوئے تھے...... محمد اکرم قلندری کا

مضبوط حوالہ اُن کی پڑھی ہوئی وہ نعت ہے جو ماضی میں ایک زمانے تک پی ٹی وی اسکرین سے آئے دن نشر ہوتی رہی......

گُور ہو جائے میرا بھی اگر طیبہ کی گلیوں میں
میں ساری زندگی کروں بسر طیبہ کی گلیوں میں

....

اس سلسلے میں بحرین پہنچنے پر مجھے میزبان تنظیم کے ایک عہدیدار راجہ صادق شاد (جو اب اس دنیا میں نہیں ہیں) نے جناب سعید قیس کا تعارف کرواتے کہا کہ "موصوف ساغر صدیقی کے شاگردوں میں سے ہیں، سینئر اور مضبوط لہجے کے پختہ کار شاعر ہیں میری خواہش ہے کہ بحرین میں ہونے والے اس بڑے اجتماع میں اُن کی مذکورہ بالا نعت بھی آپ ضرور پڑھ دیجیے گا" میں نے اُن کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے وہ نعت پڑھنے کی حامی بھر لی پھر یوں ہوا کہ اگلے ایک دو روز میں ہونے والی اس تقریب میں مجھے وہ نعت پیش کرنے کا شرف حاصل ہوا...... جب تقریب اختتام پذیر ہوئی تو راجہ صادق شاد مجھے ایک بزرگ کے ساتھ اپنی طرف بڑھتے دکھائی دیئے میرے پاس پہنچ کر راجہ صادق شاد اُن سے تعارف کرواتے ہوئے فرمانے لگے کہ یہ محترم سعید قیس ہیں...... مجھے جناب سعید قیس کی وجیہہ، خوب صورت شخصیت اور اُن کے لہجے کی شیرینی نے ازحد متاثر کیا.. اس دوران مجھے کچھ تحائف پیش کرتے ہوئے میری پڑھی ہوئی نعت کی تعریف کرنے لگے اور اُن کی لکھی نعت پڑھنے پر میرا شکریہ ادا کرتے ہوئے اگلے روز شام کو اپنے گھر کھانے پر مدعو کرنے کا حکم بھی فرمانے لگے.......... بہرحال میں اگلے روز شام کو راجہ صادق شاد کے ہمراہ اُن کی اقامت گاہ پر حاضر ہوا... جناب سعید قیس سے ملاقات کے دوران اُن کی شخصیت کے کئی پہلو مجھ پر آشکار ہوئے اس دوران معلوم ہوا کہ وہ مجذوب شاعر ساغر صدیقی کے تلامذہ میں سے ہیں اور خود اعلیٰ پائے کے پختہ کار شاعر ہیں اور حمد، نعت، سلام، منقبت، نظم، ہائیکو اور دیگر اصناف سخن میں باکمال تخلیقی درجہ پر فائز ہیں......

مجھے اُن سے ملنا اچھا لگا خصوصاً اُن کے اندر چھپے ہوئے درویش سے ملاقات نے روح کو بہت مسرور کیا اور اُن کی شخصیت میں موجود اوصاف نے مجھے اپنے حصار میں لے لیا...... بحرین میں ہمارے لیجانے کا سبب ہمارے دیرینہ کرم فرما اور پاکستان

کلب بحرین کے اُس وقت کے چیئرمین شیخ محمد زاہد بنے...... بحرین میں ہمارے چندروزہ قیام کے دوران شیخ محمد ساجد کے آفس میں ہمارے اعزاز میں ایک شعری نشست بھی رکھی گئی جس میں جناب سعید قیس کو بھی مدعو کیا گیا تھا بلکہ یہ نشست اُنھی کی صدارت میں انعقاد پذیر ہوئی تھی...... اس نشست میں مجھ ناچیز سمیت جناب سعید قیس، محمد اکرم قلندری، اقبال طارق، شیخ محمد ساجد اور شیخ محمد زاہد اور دیگر نے شرکت کی......

منعقدہ شعری محفل میں جہاں دوسرے شعر دوستوں نے کلام سنایا وہاں جناب سعید قیس کی مرصع شاعری کی روشنی آج بھی حافظے کو منور کیے ہوئے ہے مجھے معلوم ہے کہ جناب سعید قیس چند برس قبل اس دارفانی سے رُخصت ہو چکے ہیں اور میں نم آنکھوں سے یہ سطریں لکھتے ہوئے اُس ماحول میں جا پہنچا ہوں جس میں (مرحوم) اپنی شخصیت کی خوب صورتیوں سے دلفریبی کی کئی کہکشائیں روشن اور دلکشی کے کئی جہان آباد کیے ہوئے تھے...... وہ جہاں بہترین درویش منش انسان کے طور پر اپنا حوالہ رکھتے تھے وہاں اپنی تخلیقی روایت کو بھی بڑے باوقار انداز میں آگے بڑھا رہے تھے...اُن کی شاعری کے پانچ مجموعے آئے جن میں ''حدیث غم''، ''ہجر کے موسم''، ''دیوار و در''، ''محبت روشنی ہے'' اور ''عکس پڑتا ہے چاند کا'' شامل ہیں بعد ازاں اُن کے شعری کلیات کی اشاعت غیر مطبوعہ کلام کے اضافے کے ساتھ ''کلیات سعید قیس'' کے نام سے ہوئی...... اُن کا فنی اثاثہ اردو ادب میں خوب صورت حوالے کے طور پر ہمیشہ روشنیاں بکھیرتا رہے گا...... اُنھوں نے شعری زمینوں میں نہایت عمدہ تخلیقی پھول کھلائے...... آیئے اُن کے گلستانِ سُخن میں داخل ہو کر اپنے مشام جاں کو معطر کرنے کے ساتھ اپنے شعری ذوق کی تسکین کا سامان پیدا کرتے ہیں......

روشنی مجھ کو بُلانے مرے گھر تک آئی
اُس نے دیوار پہ مٹی کا دیا کیا رکھا

غم کے عنواں بدل گئے لیکن
تم کہانی کے ساتھ ساتھ رہے

یہ اُن سے پوچھ کہ اعجاز ضبط غم کیا ہے
کہ جن کو اب ترے آنے کا انتظار نہیں

وہ جس کو لوح دل پہ لکھ دیا ہو
اُسے پتوں پہ کیا تحریر کرنا

قطرۂ خون جس کو دل کہیے
اک خرابہ ہے آرزوؤں کا

دولتِ کرب چھن گئی جب سے
زندگی کا وقار ہی نہ رہا

میری آنکھوں کی ویرانی کو بھی دیکھ
وہ میلہ بھی دیکھ جو اندر لگتا ہے

ویسے تو اُن کا سارے کا سارا کلام ہی دل میں اُتر جانے والا ہے لیکن مجھے اُن کی اس ایک غزل نے کیفیات کے اک اور ہی جہان سے گزارا ہے اس غزل کے چند اشعار یہاں درج کر رہا ہوں.........

ہوا کو خاک پتہ ہے ہوا کو کیا معلوم
شجر وہیں پہ کھڑا ہے، ہوا کو کیا معلوم

یہ ہم جو ہیں نا!! ابھی فرصتِ خیال میں ہیں
یہ وقت ٹھہرا ہوا ہے، ہوا کو کیا معلوم

کسے خبر ہے کہ بستی اداس ہے ساری
یہاں سے کون گیا ہے، ہوا کو کیا معلوم

خدا کا شکر کہ ہم سبز بخت ہیں دائم
یہ دل ہرے کا ہرا ہے، ہوا کو کیا معلوم

گلی گلی یہ صحیفے، روش روش یہ گلاب
درِ جمال کھلا ہے ہوا کو کیا معلوم

یہ جبرِ ذات یہ لب بستگی، یہ مہرِ سکوت
عجیب شور مچا ہے، ہوا کو کیا معلوم

یہ ہم جو پیرہنِ غم پہن کے بیٹھے ہیں
محبتوں کا صلہ ہے، ہوا کو کیا معلوم

میں اُس کے دیدۂ حیراں کی دسترس میں ہوں
وہ مجھ کو دیکھ رہا ہے، ہوا کو کیا معلوم

خزاں کے دور میں ہم لہلہا رہے ہیں قیس
ہماری ماں کی دعا ہے، ہوا کو کیا معلوم

جناب سعید قیس اُن لوگوں میں سے ہیں جو کبھی مر نہیں سکتے... وہ زندہ رہیں گے اپنے شفاف باطن، من موہنی شخصیت اور اپنی تخلیق کردہ بے مثل شاعری کے منفرد اور مضبوط حوالوں کے ساتھ اور یقیناً "وہ تا ابد ہماری سوچوں میں دمکتے رہیں گے اور اُن کی یادوں کے چراغوں کی لو کبھی ماند نہیں پڑنے پائے گی.........

جانے کیا تھا کہ رات اُس کا خیال
راستہ ڈھونڈتا رہا مجھ میں

☆☆☆☆☆

نوید صادق کی نظم ”آشنائی کا تذبذب“: ایک تجزیاتی مطالعہ

اس شہکار نظم پر بات کرنے سے پہلے کچھ تمہیدی کلمات ضروری ہیں۔ اردو غزل کے مقابلے میں نظم نے گذشتہ پون صدی کے لگ بھگ دورانیے میں ایسی تدریجی منازل طے کی ہیں کہ عام قاری سے لے کر سکہ بند نقاد تک سبھی حیران ہیں۔ مسدس، مخمس جیسی روایتی اصناف سے نکلنے کی پہلی کاوش نظمِ معریٰ کی صورت میں نمودار ہوئی۔ اس کے بعد اردو نظم کی پہلی حیرت انگیز حد تک طویل چھلانگ آزاد نظم کی صورت لگائی جس کے دوران اس نے پابندیِ قافیہ و ردیف کی بہت چوڑی اور کافی گہری خلیج عبور کر لی۔ ابتدائی مزاحمت کے بعد جب اسے قبول کرنے پر اجماعِ امت شعرا و ناقدین ہو گیا تو پھر یہ جدید صنف ایک بگٹٹ گھوڑے کی صورت نجانے کتنے سنگِ میل عبور کرتی چلی گئی۔ اس کی جدید ترین منزل بے راست بیانیے سے انحرافی بلکہ اکثر باغیانہ رویہ اور اس عمل کا خوشگوار پہلو یہ ہے کہ یہ انداز اپنے قاری بھی خود پیدا کر رہا ہے یا یوں کہیے کہ قاری نے اس اسلوب کے ساتھ ایک غیر تحریری معاہدہ سا کر لیا ہے۔

اسی اسلوب کو اپناتے ہوئے نوید صادق نے ایک نظم ”آشنائی کا تذبذب“ لکھی جو میری نظر سے گزری تو مجھے اپنی گرفت سے اس شرط پر رہا کیا کہ میں اس کا ناقدانہ و تجزیاتی مطالعہ با قاعدہ ضبطِ تحریر میں لاؤں۔ سو کچھ عاجزانہ گزارشات پیشِ خدمت ہیں۔

نوید صادق صاحب کی نظم کا عنوان ”آشنائی کا تذبذب“ ہی قاری کو یکدم دعوتِ فکر بھی دیتا ہے اور بیرون و درونِ ذات پھیلی بے کراں تنہائی کے سمندر کا شناور بھی بناتا چلا جاتا ہے۔ اس نظم کا سب سے نمایاں پہلو اس میں موجود کثرتِ معنی ہے جو بیک وقت عصری منظرنامے کی

افتخار الحق

طرف بھی توجہ مبذول کراتی ہے اور ممکنہ آفاقیت کی جانب بھی دھیان بھٹکاتی ہے۔ پوری نظم میں ایک مصرع صرف ایک لفظ کی تبدیلی سے تین صورتوں میں مذکور ہے:

میں ہیولوں کی تاریخ کو نظم کرنے میں مصروف تھا

میں ہیولوں کی تاریخ منظوم کرنے میں مصروف تھا

میں ہیولوں کی تاریخ کی نظم کاری میں مصروف تھا

....

نظم کے ابتدائی ٹکڑوں میں ہیولوں کی تاریخ رقم کرنے کو اپنے گھر اور اپنی ذات سے منسلک بیان کیا گیا ہے جبکہ اختتامی سطور میں انھی ہیولوں کا مختصر سا تعارف کرا دیا گیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ہیولے کافی حد تک تباہ کاری کے نمائندہ ہیں۔ ہیولے بیک وقت پراسراریت، ابہام یا غیر واضح پن، تجسس، خوف اور لرزش سے عبارت ہوتے ہیں۔ ہیولے حالتِ جنگ کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں (اور حال ہی میں برصغیر کے عسکری افق پر جنگی ہیولے نہ صرف منڈلاتے بل کہ ٹکراتے بھی نظر آئے۔)

نظم کے یہ مصرعے اس کی گواہی دیتے ہیں:

میں نے بغداد سے ہو کے آئی روایات کو
اپنے کھیتوں کی سرسبز مٹی میں دفنا دیا
اور سوچا نہیں---
جنگ میں ٹھیک سے پڑھنا لکھنا تو ممکن نہیں

....

یہاں ''بغداد سے ہو کے آئی روایات'' بہت قابلِ غور ہے کیونکہ شاعر نے یہ نہیں کہا کہ بغدادی یا بغداد سے نکلی روایات۔ گویا کوئی ایسی روایات ہیں جو بغداد کے قرب و جوار جیسے جزیرہ نما عرب یا حجاز سے جنم لیتی روایات براستہ بغداد شاعر کے وطن جنوبی ایشیا تک پہنچیں اور دلچسپ بات یہ کہ شاعر نے ان روایات کو سرسبز مٹی میں دفنایا۔ عام طور پر بار آور بیج کو زرخیز مٹی میں بوتے ہیں تاکہ کوئی مفید یا منافع بخش فصل پک کر نکلے۔ اگر ''بغداد سے ہو کے آئی روایات'' کچھ نامانوس اور غیر فائدہ مند ہیں تو شاعر کو اپنی مٹی کی طاقت پر اتنا اعتماد ہے کہ اس نے ان اجنبی روایات کو اس وثوق کے ساتھ اپنے وطن کی مٹی سے آشنا کرایا کہ یقیناً جو مخلوط قبیل کی فصل نکلے گی وہ سب کے لیے سودمند ہی ہوگی۔ اب طے یہ کرنا ہے کہ کن روایات کے ہیولے مراد لینا قرینِ قیاس ہوگا۔ ممکن ہے تاتاری یلغار جسے صرف برصغیر کے خلجی نے ہی نہ صرف روکا بل کہ اسے اس کے گھر تک پٹائی کرتا لے گیا تھا۔ یہی تعبیر منطقی اعتبار سے کچھ کشش رکھتی ہے۔

یہاں آ کر قرۃ العین حیدر کے شہکار ''آگ کا دریا'' کا تذکرہ کیے بغیر بات مکمل اور مدلل نہ ہوگی۔ عینی آپا نے اپنے ناول میں اسی امتزاجی رنگ کے شاخسانے کو ایک طربیہ جملے میں کچھ مقامات پر درج کیا ہے:

''تری آواز مکّے اور مدینے''

اب اگر میں قدرے راست بیانیے میں بات کروں تو نظم کا موضوع مقامی، تہذیبی، ثقافتی اور سماجی شناخت کا بحران / identity crisis ہے جو صدیوں پرانا ہو کر بھی غیر متعلق یا لایعنی نہیں ہو سکا۔ ''آگ کا دریا'' کے کافی بعد فیض کی ایک کتاب شیما کرمانی نے مرتب کی تھی، ''ہماری قومی ثقافت''۔ اس کا موضوع بھی یہی ہے کہ ۱۹۴۷ میں دنیا کے نقشے پر ابھرنے والے ملک پاکستان کی اپنی مخصوص شناخت کیا ہوگی اور بنیادی طور پر اس سوال کی جڑیں بنگال اور پنجاب کی تقسیم میں ملتی ہیں جو اگر پاکستان کو غیر منقسم مل جاتے تو شاید یہ سوال اتنی شدت سے نہ ابھرتا کیونکہ کوئی دو عشروں بعد ہی مشرقی پاکستان الگ ہو کر بنگلہ دیش بن گیا۔ اس کے ایک عشرے بعد سندھ میں لسانی فسادات کا تعلق بھی اسی شناختی بحران سے براہِ راست ہے۔ اس بابت بہت اہم پہلو یہ ہے کہ پاکستان کے مقابل بھارت میں کہیں زیادہ لسانی و تہذیبی کثرت موجود ہے۔ اس بابت میری ذاتی رائے یہ ہے کہ

''عالمیانے / گلوبلائزیشن اور دنیا کے عالمی گاؤں میں تبدیل ہونے کے تیز رفتار اور حیرت انگیز عمل کے دوران بہت سی ثقافتی و تہذیبی شناختیں آپس میں یوں پیوست ہوتی جائیں گی کہ یہ شناختی مسئلہ شاید اپنی اہمیت کھو دے۔ یہ معاملہ وقت کے قاضی پر چھوڑنا بھی دانشمندانہ قدم ہوگا۔''

خیر یہ تو نظم کا تاریخی پہلو ہے اور تاریخی گفتگو ہمیشہ تفصیل مانگتی ہے اور یہ تقاضا درست بھی ہوتا ہے۔ واپس ہیولوں سے رجوع کر کے دیکھتے ہیں کہ قاری کے سوالات کے ہیولے مجسم اور بھرپور جواب کا سراپا کس حد تک بنتے ہیں۔ اگر بغداد کی روایات والی سطور کو نظم کی ابتدائی اور خاص طور پر درمیانی سطور سے ملا کر دیکھیں تو ایک تفہیمی اکائی بنتی نظر آتی ہے۔ نظم میں میر اور میرا جی کا تذکرہ کنایوں کی صورت موجود ہے۔ میر کی شعری جمالیات اور میرا جی کی مشہور نظم ''جاتری'' کا نہایت مختصر اقتباس کس لیے مذکور و منظوم کیے گئے ہیں؟ بغداد کی تباہی تیرھویں صدی کے وسط میں ہوئی اور تین صدی بعد سلطنتِ مغلیہ کی ابتدا ہوئی۔ میر کا زمانہ اٹھارویں صدی کی ابتدا کا ہے۔ یہ سیاسی ابتلا اور مغلوں کے زوال کا زمانہ ہے۔ میرا جی کی وفات قیامِ پاکستان کے دو سال بعد ہوئی۔ اس طرح انھوں نے بھی زبردست سیاسی انتشار اور سامراجی قوت کے ساتھ اہلِ ہند کی سیاسی جنگ دیکھی جس کے انجام پر وہ مناظر بھی دیکھے جن کی بابت فیض نے برمحل کہا تھا:

وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

یوں تفہیم کو نظم کے پچھلے ٹکڑوں کے ساتھ جوڑنے پر ایک پرکشش کثیر رنگی فضا یا

mosaic کو تشکیل دینا نسبتاً سہل ہو جاتا ہے۔ ہیولوں سے بھری بل کہ آلودہ مسلم تاریخ کے وہ ادوار جن میں امت جگہ جگہ اپنا وقار بچانے کی کچھ کامیاب اور بیشتر ناکام جدوجہد کر رہی تھی۔ اس تناظر میں دیکھیے تو نظم میں واحد متکلم کا مرکزی کردار باقاعدہ ایک مورخ بھی ہو سکتا ہے، حساس دل و دماغ کا شاعر بھی اور ایک عام انسان بھی جس کے سوالوں کا جواب مورخ اور شاعر دینے کی اپنی سی سعی کرتے ہیں۔

نظم کی ایک ممکنہ تفہیم یہ بھی ہے کہ اس میں شاعر نے وقت کے ساتھ مصروف ہوتی ہوئی دنیا میں فرد کا معاشرے کا جزوِ لازم ہوتے ہوئے بھی ایک گمبھیر اکیلا پن ہے جس کے لیے ہیولوں جیسا نہایت طاقتور استعارہ برتا گیا ہے۔ ہیولوں کا مشاہدہ کرنے والا متجسس رہتا ہے کہ کب ان کی کوئی مکمل اور منطقی طور پر زیادہ قابلِ قبول صورت بنے۔ یہ تجسس کی فضا رفتہ رفتہ ابہام کے زینے سے ہوتی ہوئی خوف کی چھت تک لے جاتی ہے کیونکہ ہیولی عدم استقامت کے باعث اپنی کپکپاہٹ بھی نہیں روک پاتا اور اپنا سراپا بھی مکمل نہیں کر سکتا۔ سو ہیولوں کی تاریخ نظم/منظوم/نظم کاری کرنے سے مراد شاعر کی شعوری یا لاشعوری سطح پر انتظار کی وہ جانکاہ کیفیت بھی مراد لی جا سکتی ہے جس میں مبہوت وہ تخیل کا قلم تھامے ایک تشنگی اور عدم تکمیل کے احساس کی کیفیت میں منتظر بھی ہے اور پرامید بھی کہ کب یہ ہیولے اپنے پورے رنگ روپ اور خال و خد کے ساتھ جلوہ گر ہوتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں شاعر کی کربناک بل کہ جان لیوا بنتی ہوئی تنہائی کب ختم ہو گی اور ختم ہو گی بھی یا نہیں۔ اس کیفیت کا ثبوت نظم میں موجود پراسراریت کی فضا ہے جو جابجا کسی مصرعے یا لفظ کو مکمل کرنے کے بجائے کچھ نقطے لگا کر ادھورا چھوڑنے سے پیدا کی گئی ہے۔ یہی عنصر نظم میں تہہ داری اور ذومعنویت کو فروغ دیتا ہے۔ ایسا کر کے گویا شاعر نے گیند قاری کے کورٹ میں پھینک دی ہے کہ:

جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

....

کے مصداق ان مقاماتِ نقاط سے آگے قاری خود کچھ اپنی قوتِ متخیلہ کو زور آزمائی کی دعوت دے کر بظاہر ادھورے متن میں اپنی پسند کے رنگوں کے پیوند لگائے۔

شاعر نے خود/ واحد متکلم کو بالواسطہ طور پر پورا انسان بیان کیا ہے جس کے اردگرد بھی انسان ہی ہیں لیکن مشینی دور نے انسان کو انسان سے اتنا دور کر دیا ہے کہ بقول صابر ظفر:

میں ایسے جمگھٹے میں کھو گیا ہوں
جہاں میرے سوا کوئی نہیں ہے

....

ایسے میں کوئی بھی حساس انسان اپنے ماحول سے آزاد، تنہائی کے کرب آمیز کیف سے لطف اندوزی کے زنداں میں خود کو محسوس کر سکتا ہے۔ اس تعبیری عدسے سے نظم کے مبہم متن کو پڑھا جائے تو

بین السطور کئی توضیحات ابھرنے لگتی ہیں۔ مثلاً یہ اختصاریت سے لبریز اختتامی مصرعے دیکھیے:

ان ہیولوں کی تاریخ
لکھنے پہ میرے علاوہ
یہاں کوئی مامور ہے؟

....

گویا شاعر جو خود کو "اولیں اجنبی" اور "آخری آشنا" کہتا ہے جس سے ملنے کوئی آتا ہے اور جانے کتنی مدت رکے رہنے کے بعد چلا جاتا ہے۔ یہ ملنے والا کہیں شاعر کے تخیل ہی کا ہیولی تو نہیں جو شاعر کی خود شناسی کا ایک وسیلہ بننے کی ناکام سعی کے بعد رخصت ہو جاتا ہے۔ اس جہت سے نظم کے ادراک کے لیے دل و دماغ کی متن کشا لہروں کو ایک مخصوص زاویے سے متن پر مرکوز کرنا ناگزیر ہے۔ ان سطور کا عمیق مطالعہ بے حد ضروری ہے جہاں شاعر نے میر کو مخاطب کیا ہے:

دھیان دیجیے ذرا
آپ پھر کھو گئے
جائیے،
میں، اکیلا بہت ہوں یہاں

....

اکیلا اور بہت اکیلا ہونے میں کتنا فرق ہے، اس کی تشریح کے لیے شاعر نے مزید سطور لکھ کر پہلے سے چلے آ رہے بالواسطہ بیانیے سے انحراف نہیں کیا۔ البتہ نظم کی ابتدا میں اسی تنہائی کے عذاب کو یوں منظوم کیا بھی ہے:

ان دنوں مجھ میں اتنی سکت ہی کہاں تھی
کہ میں اپنے سائے کو اپنی صدا سے
ذرا ہٹ کے دیکھوں

یہ ہے جدید ترین شاعری کا اسلوب جس میں:
"سرِ آئینہ مرا عکس ہے پسِ آئینہ کوئی اور ہے"

....

جیسے مصرعے کہنے کے بجائے ان کی اگلی ارتقائی منزل آج کے قاری کو کئی شعرا کے ہاں نظر آئے گی: اپنے ہی سراپے کو خود سے جدا تصور کرنا اور ایسا مضمون مشاق سے شعر میں برتنا۔ اس سمت کچھ ابتدائی قدم گذشتہ صدی کی آخری دہائیوں میں فراز نے یہ کہہ کر اٹھائے تھے:

فراز اپنے سوا ہے کون تیرا
تجھے تجھ سے جدا دیکھا نہ جائے

....

بالفاظِ دگر استعاراتی / علامتی بیانیے کی جو چند ایک بنیادی اور کڑی شرائط ہیں ان کی جدید غزل اور خاص طور پر آزاد نظم میں پوری طرح پابندی کرنا۔ شاید یہی بیانیہ نثری نظم میں اپنی معراج کو چھوتا دکھائی دیتا ہے۔ فرد کا سماج کی اکائی سے کٹ کر ایک اور ضمنی اکائی میں تبدیل ہونے کا عمل کربناک اور تشویشناک تو ہے ہی لیکن اس نے جدید شاعری کو ایک بہت بڑا اور کثیر جہتی موضوع بھی دیا ہے۔ حساس اور اعلیٰ درجے کے خلاق اذہان نے اس چیلنج کو قبول کیا ہے اور نوید صادق مجھے ایسے شعرا کی اگلی صف میں کھڑے نظر آتے ہیں جہاں موضوع ہی امام ہے۔

☆☆☆☆☆

جلیل القدر خوبیوں کے حامل شاعر......جلیل عالی

اچھی شاعری وہ ہے جو قاری یا سامع کے دل کو چھو جائے، اُسے متاثر کرے اور اُسے سوچنے پر مجبور کرے۔ اس میں الفاظ کا خوب صورت استعمال، خیال کی گہری اور احساسات کی سچائی ہونی چاہیے۔ ایک اچھی شاعری میں وزن اور بحر کی پابندی بھی ضروری ہے، لیکن اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اس میں تخلیقی صلاحیت اور فنکارانہ مہارت کا اظہار بھی ہو۔ ایسی تمام خوبیاں ہمارے عہد کے ماہرِ اقبالیات، جلیل القدر اسلامسٹ، ترقی پسند، کثیرالجہتی شاعر جلیل عالی کے شعری اسلوب میں موجود پائی جاتی ہیں۔ شخصیت کے اعتبار سے عالی صاحب ایک وضع دار، ملنسار، خوش گفتار اور عجز و انکسار کے پیکر بھی ہیں۔ ان کے شعور و ادراک کی حیات و کائنات دلکش اور مشاہدات کی دنیا بہت وسیع ہے۔ انھوں نے اپنے کلام کو مشاہدات کی روشنی میں جذبے اور احساس کی رنگینی عطا کی ہے۔ اسی طرح ان کے فکری حدود میں تنقید، تحقیق، حمد و نعت، نظم اور غزل شامل ہیں۔ عالی صاحب مشرقی و مغربی فکری علوم و ادبیات پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں۔ وہ

صدام ساگر

ایک بریک بین آدمی ہے - جس طرح مرصع ساز نگینوں کو جوڑ کو حسن پیدا کرتا ہے اُسی طرح شاعر الفاظ کی بندش سے نگینوں کو جڑنے کا کام لیتا ہے- عالی صاحب کے کلام بھی ترشے ہوئے الفاظ، موتیوں کی طرح تسبیح کی مانند پروئے ہوئے معلوم ہوتے ہیں- کیوں کہ اچھی شاعری ہر قدم پر نیا درد مانگتی ہے اور عالی صاحب کے مشاہدات اور تجربات اتنے ہیں کہ اظہار کے سلیقے کے ساتھ فن کا یہ فکری مطالبہ پورا کر سکتے ہیں- یقیناً وہ زندگی کی دھوپ چھاؤں، سدا بہار موسموں کی کیفیتوں سے خوب واقف ہیں - ان کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

یہ کس رُخ پر سواری دل کی چلتی جارہی ہے
ہوس دنیا کی بڑھتی، عمر ڈھلتی جارہی ہے

....

بے برکت اظہار اسی کو کہتے ہیں
لفظ الجھنے لگ جاتے ہیں معانی سے

....

اس کے سخن سے ہم نے نکالے ہیں جو نکات
اس سے بھی کچھ زیادہ لطافت کی بات ہے

ایسے بے شمار اشعار ان کے تازہ مجموعہ غزل ''آگے ہمارا خواب ہے'' میں پڑھنے کو ملتے ہیں- عالی صاحب کی غزل اپنے اندر انسانی جذبات اور احساسات کی عکاسی کرتی ہے- عشق، محبت، ہجر، وصل، غم، خوشی اور دیگر جذبات کو غزل میں بڑی عمدگی اور صاف گوئی کے ساتھ بیان کیا ہے- ان کے غزل کے اشعار مختصر لیکن ان میں گہرا مفہوم پایا جاتا ہے- ان کی غزل کی زبان شستہ اور رواں ہے جس میں الفاظ کا چناؤ بڑا ناپ تول کر کے کیا گیا ہے- تا کہ اسے پڑھنے والے کو آسانی سے سمجھ آجائے - انھوں نے غزل کہتے ہوئے زبردستی کی مشکل ردیفوں، دقیق زمینوں اور بلاوجہ کی ترکیبوں سے اجتناب کیا ہے - ان کے ہاں ردیف کیسی بھی ہو قوافی کیسے بھی ہوں- زمین کیسی بھی سخت اور پتھریلی ہو، اُن کی طویل ریاضتِ فن کا ثمر ہے کہ زرخیز ہو جاتی ہے-

اس حوالے سے توقیر عباس اپنے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ ''جلیل عالی میں ایک اہم اختصاص یہ بھی ہے کہ بہت عام اور پامال لفظ کو یوں استعمال کرتے ہیں کہ اس کے معانی بدل جاتے ہیں- یہ کام زبان و بیان

کے گہرے شعور کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ مجاز مرسل کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس میں تشبیہ کا کوئی علاقہ نہیں ہوتا لیکن ایسی مثال اردو ادب میں کبھی زیرِ مطالعہ نہیں آئی کہ ایک لفظ بطور مجازِ مرسل معنوی کفالت کی ذیل میں جو مثالیں دی جائیں گی، ترقی پسند فکر کی عکاس ہوں گی جو درج بالا مذکورہ تمام بیانات کا اثبات بھی کرتی ہیں۔ جلیل عالی کی پاکستان کی سماجی، سیاسی، اسلامی تہذیبی تشکیل، تاریخ، ماضی و حال پر بہت گہری نظر ہے، اس لیے ان کے اشعار میں معاصر صورتِ حال کی بھی بھرپور جھلک ڈلک موجود ہے۔''

قرض کیسے تھے جو اس طور ادا ہونے تھے
جیسے ہونی نے لیے چھین ہنر بستی کے

....

جلیل عالی اپنے عہد کے جلیل القدر خوبیوں کے حامل شاعر ہی نہیں، بلکہ بیدار مغز آدمی بھی ہے۔ انہوں نے ندرتِ خیالات سے الفاظ کو نئے نئے معانی کا نہ صرف جامہ پہنایا ہے بلکہ نئے نئے استعارات، تشبیہات، علامات، محاورات، تلمیحات اور تراکیب کا استعمال کر کے غزل کو عظمت و رفعت بخشی ہے۔ ایک مرتبہ پھر توقیر عباس کے بقول ''جلیل عالی کے لیے غزل اور نظم دونوں لسانیاتی، سماجی، تاریخی، علمی اور شعری دانش کے اظہار کا منبع ہیں لیکن کہیں بھی فن سے دستبردار ہو کر محض اپنی بات کی ترسیل نہیں کرتے۔ یہی ان کی فنی قدرت کا ثبوت ہے۔'' ان کے نزدیک شاعری ایک بہت کٹھن کام ہے اس کی ترسیل ہر کسی کے بس کی بات نہیں: اس شعر کے مصداق:

شاعری صرف خیالات کی ترسیل نہیں
ایک تخلیقِ طلسمات ہے الفاظ کے ساتھ

....

اس دھرتی میں ظلم و استبداد، بربریت، سفاکیت کے ہوتے ہوئے ایسے عظیم لوگ بھی پیدا ہوئے ہیں، جو کہ انسانیت کے لیے اپنی زندگیاں وقف کرتے ہوئے اُن کے چہروں پر تبسم کے پھول کھلانے، نوکِ قلم سے انقلاب لانے کا عزم، سچے ادب کے خدمت گار، اُخوت، اتحاد و یگانگت اور امن آشتی کی خوشبو، رہبر کے لیے شعور و نظم و ضبط اپنانے کی نصیحت، شعور ذات کا احساس، دل کی روشنی سے حکمت و دانش کا نور پھیلانے کا مقصدِ حیات، وقت کے

ظالم فرعونوں، شدّادوں اور یزیدوں سے بغاوت کا اعلان، مفلسی کے مارے ہوئے غریبوں اور ناانصافیوں کے خلاف احتجاج، انسانی معاشرتی رویوں پر گہرا طنز جیسے دیگر موضوعات کو جلیل عالؔی جیسے دردِ دل رکھنے والے شاعر کی غزل کا خاص موضوع ٹھہرا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں کے اشعار میں زندگی کے حقائق بھی ہیں اور وارداتوں کی تصویریں بھی، تخیل کی بلند پروازی بھی اور عمیق مشاہدات کی روشنی بھی، نازک احساسات کی بھرمار بھی اور معنی آفرینی بھی اور مفاہیم کی کہکشائیں بھی شامل ہیں۔ وہ جو کچھ آنکھوں سے دیکھتے ہیں اُس کی تصویر لفظوں کی صورت میں کچھ اس طرح سے اُتار لیتے ہیں۔

کچھ اپنی بھی سوچ سموتے لفظوں میں
تم نے تو بس اک تصویر اُتاری ہے

....

عالی صاحب نے اپنے عہد کے مسائل کا بیان اپنی غزلوں میں نہایت سلیقہ مندی اور دردآمیزی سے کیا ہے۔ یہ درد ان کا اپنا پالا ہُوا نہیں بلکہ ان کے آس پاس رہنے والے لوگوں کا درد ہے جن کے چہروں پر وہ تبسم کے پھول کھلا کر اُن کے سب درد اپنے دامن میں ڈال لاتے ہیں۔

عالی کیسا درد سخن میں بھرتے ہو
برچھی سی سینے میں گڑتی جاتی ہے

....

''آگے ہمارا خوابیہ ہے'' میں جلیل عالی نے جدید اُردو غزل کے جو تقاضے تھے وہ تمام انہوں نے نبھائے ہیں اور تمام لوازم پورے کیے ہیں۔ اس دلکش شعری مجموعے کو ہمارے پیارے دوست عارف فرہاد نے اپنے اشاعتی ادارے ''فرہاد پبلی کیشنز'' سے بڑی نفاست اور خوبصورتی کے ساتھ پبلش کیا ہے۔ اس کتاب کا انتساب عالی صاحب نے اپنی پیاری پوتی شِفا ثوبان کے نام کیا ہے۔ میں عالی صاحب کو اس کارِ نمایاں پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں اور یہ بات پورے وثوق سے کہتا چلوں کہ بہ حیثیت شاعر وہ جدید غزل کی بنیاد پر اپنے ہم عصر اور ہم عمر شعرا سے منفرد و ممتاز ہو گئے ہیں۔

ازل سے بے کراں ہونے کے سودائی ہیں عالی
حدِ امکاں سے بھی آگے ہمارا خوابیہ ہے

☆☆☆☆☆

التجا کی دہلیز پر کھڑا شاعر...... مظہر امام

حضور سرور کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدح و توصیف بصورتِ نعت آپ کی ولادتِ باسعادت سے قبل سو (100) سے زائد صحائفِ سماویہ اور زبور، توریت، انجیل میں تحسین سے مُحَمَّد، اَحْمَد، فارقلیط مُنحمنّا، مُشَفَّع، مَاذ مَاذ، نَبِی الامیین، المختار، المُعزیّٰ اور دیگر اسمائے گرامی مرقوم ہیں۔ ورفعنا لک ذکرک کے تفسیری جھروکوں میں جناب ابو طالب علیہ السلام اور جناب حسان بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے لے کر چہار دانگِ عالم میں سرورِ سروراں ہادیٔ عالم کی ثنا گوئی نعت کے آئینے میں جلوہ گر ہو رہی ہے۔

نعت کے دیوان اور مجموعہ ہائے نعت مختلف زبانوں میں مدتوں سے منصۂ شہود پر رونما ہو رہے ہیں اسی سلسلے کی کڑی دلفریب نعتیہ مجموعہ ''حرفِ التجا'' بدستِ اخی ذی احتشام علی رضا بصیرت افروز ہوا ہے۔ یہ نعتیہ کلام سینئر شاعر مظہر امام کی کہنہ مشقی، محنت شاقہ اور پاکیزہ ریاضت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

''حرفِ التجا'' کے دلفریب جہانِ سخن میں داخل ہو جائیں تو عقیدت و محبت کے کئی در وا ہوتے چلے جاتے ہیں اس مجموعہ تقدیس و برکت میں مترنم اور رواں بحروں میں جس پُرکاری اور پختگی سے اشعار مرقوم ہوئے ہیں اُن کے مطالعہ سے قاری محبت و مؤدت اور روحانیت کی وسعتوں میں کہیں جا پہنچتا ہے۔

مظہر امام نے آقائے دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذاتی و صفاتی اسمائے گرامی اشعار کی مالا میں نہایت خوب صورتی سے پروئے ہیں مثلاً محمد، احمد، آقا، مولا، شاہ ابرار، شاہِ بدر الدجا، سیدِ ابرار کرم حضور، سرور عالم، سرورِ کُل، شہ دوسرا، شاہ عرب،

محمد امین ساجد سعیدی

شہِ کون و مکاں، سرورِ کونین، رحمتِ عالم، سرکارِ دو عالم، مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم-----

''حرف التجا'' کے اکثر اشعار سہل ممتنع کی جملہ خوبیوں سے مزین ہیں۔ کلام میں حسن و رعنائی، فکری و عروضی محاسن، فصاحت و بلاغت، استعارات و تلمیحات، طلاقتِ لسانی، سلاست،

طرز ادا کی دلآویزی

اُسلوب میں بیان کی نزاکت اشعار کی روانی یا شیفتگی بدرجہ اتم موجود ہے۔ درج ذیل مضامین اشعار میں خوشنمائی، دلفریبی اور خوش سلیقگی کی کیا عمدہ مثالیں لئے ہوئے ہیں سے بیان کیے ہیں:

حُسنِ محمد، درود وسلام، شہرِ مدینہ، سبز گنبد، روضۂ اقدس، اُسوۂ سرکار، درِ حضور، سنتِ مصطفےٰ، روزِ محشر، اُمتِ مرسل، رحمتِ کُل صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم---

جس طرح ہوئی اُمتِ مُرسل کی جہاں میں
ایسی بھلا کس قوم کی تعلیم ہوئی ہے

....

رحمتِ کُل زینتِ دارین ہیں
میرے آقا سرورِ کونین ہیں

....

کس قدر شہرِ مدینہ کے نظارے ہیں حسیں
کیا عجب لوگ ہیں جو ان کو بھلائے ہوئے ہیں

مظہر امام کے پاکیزہ و معطر تخیلات کی بلند پروازی، اعلیٰ فکر، پرشکوہ لفظی دروبست، لفظوں کی معنویت، اسالیب و لطافت، روح پرور خصائل وشمائل کے بیان کی تفہیم میں بلیغ اظہار کے لیے ان کے وسعتِ مطالعہ پر دال ہے۔ کلام کی تازہ کاری کے انتہائی دلکش، حسین وجمیل کیف آگیں تراشیدہ لفظوں سے آراستہ اس مجموعۂ کلام سے خوب صورتی وا ہوتی ہے۔ الفاظ کی تراکیب، خیال کی بندش درج ذیل تمثیلات سے خاطر نشین کیجیے:

نورِ خداوند، زینتِ دارین، گنبدِ سرسبز، قلبِ پریشاں، مہر و ماہ، حسن و جمال، فضائے دل، دائمی حیات، ایمان مبین، نخلِ تمنا، سیرت اطہر وغیرہ فکری حوالے سے کلام میں گہرائی و گیرائی کا اُسلوب استادانہ رنگ میں میں ڈھلا ہوا ہے جو یقیناً مظہر امام کی پوری زندگی کا بندگی کے آہنگ میں خوب خوب پیرایۂ اظہار ہے۔ اگر اُن کے کلام کو فنی حوالے سے دیکھا جائے تو ''حرف التجا'' بہت خوبیوں سے مملو نظر آتا ہے مثلاً ذیل میں صنعتِ وصل الشفتین کا مصرع دیکھیے جس میں تکرار لفظی کا بھی حسن جھلکتا نظر آتا ہے۔

محمد محمد مدینہ مدینہ

تکرار لفظی کے چند اشعار دیکھیے:

اُسے جہاں میں ملی شہرتِ دوام امام
نبی کی ذات کا جس جس نے احترام کیا

....

کیسے کیسے محاذ دنیا کے
سر کیے آپ نے شرافت سے

....

صنعت سہ حرفی میں دو اشعار دیکھیے:

محشر کی کڑی رت میں اماں بخشنے والا
اُس گنبدِ سرسبز سا سایہ نہ کوئی اور

....

آپ کی سرور دیں مدح سرائی مجھ سے
جس طرح چاہیے تھی ہو نہیں پائی مجھ سے

....

صنعتِ تضاد میں دو اشعار ملاحظہ کیجیے:

رات دن اُن کی ہیں رحمت کے طلبگار امام
ہم جو عصیاں کا بہت بوجھ اُٹھائے ہوئے ہیں

....

جو پھوٹتی ہے آپ کے حُسن و جمال سے
وہ روشنی کہاں ہے بھلا مہر و ماہ میں

....

لسانی و ادبی حسن میں محاورات کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ نثر ہو یا نظم ہر دو صورت میں برمحل محاورہ کا استعمال تفہیم کے محاسن اور حسن و دلکشی میں اضافے کا باعث ہوتا ہے۔ موصوف کے کلام میں درج ذیل چند اشعار میں اُن کی قادر الکلامی کا اندازہ کیجیے:

پیٹ پہ پتھر باندھنا فاقے کی تکلیف برداشت کرنا

سرورِ کُل کی قناعت پہ میں قربان جاؤں
جس نے اُمت کے لیے پیٹ پہ پتھر باندھا

دل میں سمانا۔ کسی بات کا یقین ہونا

جب سے گزرے ہیں نگاہوں سے در و بام ترے
کیف کے رنگ کئی دل میں سمائے ہوئے ہیں

پہ قافیہ باندھنا۔ کسی قافیے کو شعر میں نظم کرنا

اپنی تاثیر میں یکتائی لیے آیا ہے
قافیہ نعت میں جب کوئی بھی مظہر باندھا

پہ رام کرنا۔ تابع کرنا

مرے رسول کا حُسنِ سلوک ایسا تھا
وہ جس کے فیض نے سارے جہاں کو رام کیا

....

مظہر امام کے کلام میں بہت سی صنعتوں کا اشعار اور مصرعوں میں سنگم بیان کی تاثیر میں اضافہ کرتا ہے۔ مثلاً صنعتِ فوق النقاط، صنعتِ تحت النقاط، صنعتِ غیر منقوطہ و صنعتِ منقوطہ اور صنعتِ اطراد اور صنعتِ سیاق الاعداد میں ان کا فنی و فکری اثاثہ ادبی دستاویز سے کم نہیں اختصار کی روا تھامتے ہوئے اِس دعا کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ اپنے محبوب کے وسیلے سے ''حرفِ التجا'' کو قبولیتِ عام اور شہرتِ دوام عطا فرمائے اور مظہر امام کے لیے یہ توشۂ آخرت بنائے---- آمین

☆☆☆☆☆

عالی کا "خوابیہ": (فکری گہرائی، اسلوبی جدت اور مستقبل کی بصیرت)

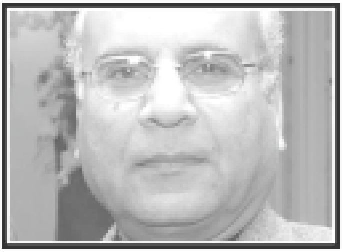

جناب جلیل عالی اردو شاعری کی دنیا میں استاد الشعرا کے طور پر مانے جاتے ہیں۔ "آگے ہمارا خوابیہ ہے" ان کا تازہ ترین مجموعہ کلام ہے۔ یہ مجموعہ، ان کی شعری، فکری اور اسلوبیاتی جہتوں کا عکاس ہے۔ عالی صاحب ان چند شعرا میں سے ہیں جنھوں نے معاصر اردو شاعری کو نئے رجحانات اور امکانات سے آشنا کیا ہے۔ زبان کو نئے الفاظ اور شاعری کو الفاظ کے تجریدی اور تجدیدی استعمال سے ثروت مند بنایا ہے۔ ان کی شاعری محض الفاظ کا خوب صورت مجموعہ نہیں، بل کہ فکر وفن کا ایک گہرا امتزاج ہے جو قاری کو زندگی، حقیقت اور نئے تصورات کے سمندر میں غوطہ لگانے کی دعوت دیتا ہے۔ وہ خود اس بات کا اظہار کرتے نظر آتے ہیں کہ شاعری منظوم مضمون تراشی نہیں ہے بل کہ یہ تو صوتی، سمعی اور بصری رنگا رنگی سے کہیں آگے کی چیز ہے۔

شاعری صرف خیالات کی ترسیل نہیں
ایک تخلیقِ طلسمات ہے الفاظ کے ساتھ

....

کہتے ہیں اُسے شاعری پڑھ کر جسے انساں
ہوتا ہے جس انداز کا ویسا نہیں رہتا
یہ جو تراشِ نَو ہے سرِ سطرِ ضَو فشاں
اک موجۂ خیالِ دگر کا کمال ہے

....

جس سے جھلکے کوئی جہانِ دگر
شعر عالی وہی کہتا ہے

....

بنجر حرفوں کیسے ممکن سینوں کی سیرابی
اشکوں کی برسات ضروری ورنہ بات ادھوری

....

پسِ حرف و صدا عکسِ رجایوں جھلملائیں
لشکتی جھیل ہو جیسے گھنے اشجار پیچھے

....

عالی صاحب کی شاعری کے گہرے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ زندگی کو ایک وسیع اور ہمہ جہت تناظر میں دیکھتے ہیں۔ وہ زندگی کے روایتی مفہوم سے آگے بڑھ کر اس کے معروضی اور

عمر عزیز

روحانی پہلوؤں کو اپنی شاعری کا حصہ بناتے ہیں۔
زیرِ نظر مجموعے میں بھی زندگی کو درپیش مسائل، اس کے پوشیدہ رازوں اور اس کی گہری حقیقتوں کو نئے انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اب وہ چاہے درپیش حالات ہوں، روانیِ وقت کا احساس ہو، ناسٹیلجیا ہو، ہجر و وصال ہو، وطن کو درپیش سیاسی و سماجی مشکلات ہوں، نظریاتی بنجرپن ہو یا پردیس جا بسنے والوں کا نوحہ، عالی صاحب سب پر گہری نظر رکھے ہوئے ہیں۔

ہوا میں بادلوں سا تیرتے تھے
وہ دن جانے کہاں گم ہو گئے ہیں

....

کسی تہذیب کے تب آخری دن ہوتے ہیں
خوبیِ خیر بھی جب وجہِ خطر ہو جائے

....

خوش آگئیں انہیں جھیلیں پرائے دیسوں کی
مرے شجر کے پرندے کہاں پہ جا ٹھہرے

....

شجر سے دور دیسوں کی طرف نکلے پرندو
تمھاری یاد میں چپ آشیانے جاگتے ہیں

....

ایک سب کا ہے ہر انساں
آپ اپنا خدا بناتا ہے

....

منہدم شہر تو کر سکتے ہیں لیکن عالی
خواب ڈھانے کی سکت آتش و آہن میں نہیں

....

کون سفر آغاز کیا تھا کیا منزل انعام ہوئی
پرچم کیا لہرایا گیا تھا کس صحرا میں لایا گیا

....

عشق میں ہجروں گرد اڑانی پڑتی ہے
اور صحراؤں بیچ بھنورا ہوتا ہے

....

سرِ شعور مسلسل چراغ جلتے رہے
لہو میں رقص کوئی اضطراب کرتا رہا

....

کوئی تصویر نگاہوں میں نہیں بن پاتی
دل کے اطراف مگر چھن چھنا چھن سی کچھ ہے

....

اور معقول یقین سمت سرک سکتا ہوں
کسی مجہول گماں کا تو نہیں بن سکتا

....

ڈرا رہے ہیں برابر مجھے ستارہ شناس
میں ست رو قدم آگے بڑھائے جاتا ہوں

....

جیسے ہر ایک شخص کا اپنا سچ ہوتا ہے، عالی صاحب پورے خلوص سے اپنا سچ بیان کرتے نظر آتے ہیں اور اس سچ کا اظہار ڈھکے چھپے الفاظ میں نہیں کرتے بلکہ ڈنکے کی چوٹ پر کرتے ہیں۔ وہ اس بات کا ادراک تو رکھتے ہیں کہ ہر شخص کے دل تک بات پہنچانا ناممکن ہے مگر یہ امر انہیں اپنی بات کہنے سے نہیں روکتا۔

خدا کو صبح دم کچھ پرچیاں کاموں کی دے کر
نکل جاتے ہیں خود دنیا کمانے ہم گھروں سے

سچ پورا ادھر ہے نہ اُدھر پہ یہ کشاکش
دو چار قدم آگے بڑھائے گی کہانی

....

عدو کے پاؤں میں رکھ دیں بڑوں نے دستاریں
ہمارا فیصلہ سنتے ہمارے سر لیتے

....

سمے نے چھین لی ہے سوچ بینائی مگر دل
برابر دیکھ لیتا ہے ابھی دیوار پیچھے

....

کس کے سینے میں کوئی خواب اتارے اپنے
ہر کسی کے ہیں جدا شوق ستارے اپنے

....

یہ کس رخ پر سواری دل کی چلتی جا رہی ہے
ہوس دنیا کی بڑھتی عمر ڈھلتی جا رہی ہے

....

فصلی بیاتیوں کا مقدر یہی تو ہے
آندھی کی مثل آئے، بگولے کی گوں گئے

....

زمانہ در زمانہ ہے یہی روداد اپنی
ہمیں روندا گیا عالی عبوری دانشوں سے

....

گھروں کے بیچ بھی کُنبے کہاں ہیں فرد ہیں بس
کہ مشترک کوئی شادی غمی نہ رہنے دی

....

یہ دیکھ لوگ تجھے کس نظر سے دیکھتے ہیں
خود اپنے آپ کو برتر شمارنا نہیں ٹھیک

....

اک بار شاخِ لب پہ کلی سچ کی کیا کھلی
پھر اس کو بھی کہیں سے کوئی فون ہو گیا

....

دیکھو گے کہ لکھی ہوئی جن کی ہے انہیں بھی
اب اپنے اشاروں پہ چلائے گی کہانی

....

کون کہتا ہے کہ حال اپنا برا ہو گیا ہے
دیکھ کشکول تو پہلے سے بڑا ہو گیا ہے

....

عالی صاحب کے نزدیک حقیقت کا موضوع مرکزیت کا حامل ہے۔ وہ حقیقت کو محض ظاہری سچائی تک محدود نہیں رکھتے، بلکہ اس کے اندرونی اور فلسفیانہ ابعاد کو بھی چھوتے ہیں۔ ان کے کلام میں روایتی نقطہ نظر سے ہٹ کر حقیقت کی نئی تعبیرات ملتی ہیں۔ اب یہاں یہ بات کچھ متضاد محسوس ہوتی ہے کیونکہ ان کی کتاب کا نام تو حقیقت نہیں بلکہ ”خوابیہ“ ہے لیکن اگر غور سے پرکھا جائے تو یہ آشکار ہو گا کہ اس میں کوئی تضاد نہیں۔ دراصل وہ ایک خواب کی تعبیر کی بنیاد پہ کھڑی حقیقت کو اگلے خواب کا زینہ سمجھتے ہیں۔ اور جب وہ اپنے خوابیے کی منزل مراد کو پا لیں گے تو یقیناً آگے ایک اور خوابیہ ان کا منتظر ہو گا۔ پیش بینی اور حال میں رہتے ہوئے مستقبل کی تعمیر کا غیر مبہم مگر پرت دار خواب ہی دراصل ”آگے ہمارا خوابیہ ہے“ کے عنوان سے جھلکتا ہے۔ یہی خوابیہ

روایت سے جڑے رہ کر ایک روشن اور ترقی پسندانہ فکری نظام کی بنیاد رکھتا ہے۔ ان کی شاعری میں جدید سوچ، رائج الوقت فکری ڈھانچوں کو چیلنج کرتے ہوئے بصیرت افروز نظریات، سماج کو درپیش مسائل پہ گہری نظر اور محبت جیسے نفیس جذبے کے ساتھ ساتھ عشقِ نبیؐ کی چاشنی انہیں محض ایک شاعر نہیں رہنے دیتی بلکہ اس سے آگے بڑھ کر ایک مفکر کی حیثیت دیتی ہے۔ اور یہ ان کے فن اور کرافٹ کے اعتراف کے ساتھ ساتھ رب کے اس خاص کرم کا بھی اعتراف ہے کہ ان کے استعمال کردہ عام اور سادہ الفاظ بھی گہرے فلسفیانہ خیالات کے حامل بن جاتے ہیں۔ یہی چیز ان کی شاعری کو ماضی، حال اور مستقبل کا احاطہ کرتے ہوئے وقت کی قید سے آزاد کر دیتی ہے۔

کچھ ایسے اُس کی نگاہ نمو اٹھی عالی
تہالِ شوق پہ اکھوے ہرے بھرے نکلے

....

آتے ہوئے جاں تاب زمانوں کا ہو شاعر
میں خواب نگاہوں کو پرانے نہیں دیتا

....

اُس کی دُھن کو کون ہوا نابود کرے
جس دُھن ساتھ کوئی غیبی منظورہ ہے

....

ہم اسی فطرتِ جاری کی رچا جیتے ہیں
موسموں بیچ جو گلزار میں بن سی کچھ ہے

مرا لکھا ہوا خلوت میں پڑھ یہ خواب نامہ
جگو مائے ہوؤں کو کاروانے جا رہا ہے

....

جلیل عالی صاحب سیاسی اور معاشرتی نظام کے بارے میں ایک ٹھوس بنیاد کی سوچ رکھتے ہیں جس میں دلیل کے راستے تو ترمیم ممکن ہے مگر شور و غل اور ہاؤ ہو سے اسے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اور یہ نظریاتی سوچ کسی بھی سیاسی گروہی وابستگی سے برتر ہے۔ ان کی حب الوطنی اور پاکستانیت اس نظریے کی اساس ہے اور ان کی شاعری میں جا بجا موجود اشعار اس بات کی گواہی دیتے ہیں۔

قبولا ہے فقط خاکِ وطن کی نسبتوں سے
کوئی شہ گل بھی اپنی آنکھ کا تارہ نہیں ہے

....

زمیں سے روٹھ کر سب خواب جیسے
خلائی بستیوں میں جا بسے ہیں

....

ہم صفحگی ہے کس سے کشاکش ہے کس کے ساتھ
کھلتا نہیں کہ اب کے وہ مہ وش ہے کس کے ساتھ

....

دل کیا کسی گروہِ سیاست کا ساتھ دے
یہ کھیل اقتدار کے بھوکوں کا کھیل ہے

....

رفتارِ سفر کم تو وہ کر سکتا ہے میری
مجھ کو مرے رستے سے ہٹا دے نہیں ممکن

دھرا ہے وقت کی دہلیز پر سارا اثاثہ
وہ جانے کب کوئی داغ قبا مہتاب کر دے

....

ہماری خاک جدا پانیوں سے گوندھی گئی
الگ شباہت و سیرت میں ہم کو ڈھالا گیا

....

اپنے سالار سے کتنا بھی ہوں نالاں، لیکن
تیر دشمن کی کمان کا تو نہیں بن سکتا

....

میں اپنے آپ کو اس قابل نہیں سمجھتا کہ جناب جلیل عالی کی شاعری کے فنی محاسن گنواؤں۔ اور نہ ہی میں یہ جسارت کر سکتا ہوں کہ ان کی شعری تکنیک پر کوئی رائے دوں۔ لیکن یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ عالی صاحب جیسا اختراعی انداز کسی بھی اور شاعر کے ہاں ناپید ہے۔ اور اس کی ایک وجہ وہ سخت تخلیقی معیار ہے جو انھوں نے اپنے لیے مقرر کر رکھا ہے۔ وہ خود ہی کہتے ہیں کہ:

غزل تکمیل پاتے ہی کروں محسوس عالی
مرے معیار کا تو یہ سخن پارہ نہیں ہے

....

عالی کارِ ہنر کے بھی اسرار ہزار ہیں کیا کہیے
عرض گزاریں کتنی غزلیں اک مصرع فرمایا گیا

....

بے برکت اظہار اسی کو کہتے ہیں
لفظ الجھنے لگ جاتے ہیں معانی سے

....

مدھم کر دیتی ہے نزول احساس کی لو
یہ جو شعر گروں کی پختہ کاری ہے

....

کسی سطر اتری نہ حرفوں میں عالی
جو روح جمالی ہم ارمانتے ہیں

....

عالی سخن لہو کے تکلم کا نام ہے
تجھ سے تو واجبی سی ریاضت نہیں ہوئی

....

اسی بے برکت اظہار سے بچتے بچاتے وہ اس خواہش کا اظہار کرتے ہیں کہ

....

شعر ایسا کوئی کہوں کہ لگے
وقت مصرع مرا اٹھا رہا ہے

....

اقبال کی طرح کا کوئی شعر ہو نصیب
ہم بھی کبھی زمینِ سخن آسماں کریں

....

”آگے ہمارا خواب ہے“ اس امید اور ترقی پسندی کی علامت ہے جو ان کی شاعری کی رگ رگ میں بسی ہوئی ہے۔ یہ خواب ایک ایسا مستقبل ہے جہاں انسان نئے افکار اور بصیرتوں کے ساتھ حقیقت کی گہرائیوں کو سمجھ سکے اور زندگی کے سفر کو مزید بامعنی بنا سکے۔

ازل سے بیکراں ہونے کے سودائی ہیں عالی
حدِ امکاں سے بھی آگے ہمارا خواب ہے

☆☆☆☆☆

کلیم خارجی کے چند نئے افسانے اور تاثرات

اگرچہ کسی بھی ادیب کی پہچان کا ایک پیمانہ ہوتا ہے اور ہر ادیب صاحب اسلوب کہلاتے ہیں، صاحب اسلوب کے خصوصیات کے اسباب میں کئی عوامل کارفرما ہوتے ہیں جن میں مصنف کی شخصیت، ذہنی ساخت، تجربات اور اس کے زمانے کے اثرات شامل ہے۔ دور حاضر کی ادیبوں بالخصوص افسانہ نگاروں کی فہرست پر نظر ڈالی جائے تو کلیم خارجی ان گنتی کے چند صاحب اسلوب شخصیات میں شامل ہے۔

کلیم خارجی کے اسلوب کی نمایاں خصوصیات میں ان کی علمی گہرائی، موضوع پر مکمل گرفت، اور واضح انداز تحریر شامل ہیں، انھوں نے ادبی اور سماجی علوم وفنون پر بہت کام کیا۔ ان کی تخلیقات کا نظر غائر مطالعہ کیا جائے تو ان کی تحریروں میں موضوع کی باریکیوں کو سمجھنے اور انہیں قارئین تک پہنچانے کی اہلیت نمایاں نظر آتی ہے۔

ان کی تحریروں میں موضوع کی گہرائی اور گیرائی پائی جاتی ہے وہ کسی بھی موضوع پر بات کرتے ہوئے اس کی تمام جہتوں کا احاطہ کرتے ہیں۔

افسانہ کالے منہ والے میں کلیم خارجی رقم طراز ہے کہ ”محافظ ان سب کو محل کے ایک روشن کمرے میں لے جا کر بولا لو دیکھ لو۔ ایک دوسرے کا منہ۔ تم نے ایک دوسرے سے اپنا منہ چھپانے کی کوشش کی ہوئی ہے یا تمھارے کالے کرتوت کی پھٹکار تمھارے چہروں پہ آپڑی ہے“

ان کا انداز تحریر سادہ اور واضح ہوتا ہے جس کی وجہ سے ان کی باتیں آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہیں۔

وہ پیچیدہ علمی مباحث کو بھی عام فہم زبان میں بیان کرتے ہیں۔ ایک جگہ پر یوں لکھتے ہیں کہ ”بعض لوگ کرپشن کو اپنا پیدائشی حق تصور کرتے ہیں“ اگرچہ بعض باتوں میں رمز و کنایہ کا پیرایہ اختیار کرتے ہیں کیوں کہ آپ سمجھتے ہیں کہ انسان مذہبی قیود سے آزاد

نوید عائل

ہو کر بھی خالق اور معاشرت کے ضابطے کی پابندی کرسکتا ہے۔ مختصر مگر جامع افسانہ ''چوں'' میں لکھتے ہیں کہ ''فخریہ انداز سے اعلان کرتے ہوئے بولے اور اس کا ختنہ میں خود اپنے ہاتھوں سے سرانجام دوں گا ان کے اس اعلان کے بعد نسوانی آوازوں کی گونج ابھری، ہائے ہللا---

اسی ہی افسانے میں آگے رقم طراز ہے کہ ''میرے اندر اس قسم کی ہراسمنٹ کے خلاف کوئی دفاعی نظام موجود نہیں تھا اور پھر ایک لمبی سی باریک چوں کے بعد ریورٹ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔

انھوں نے جن موضوعات پر بھی لکھا، ان پر انھیں مکمل دسترس حاصل تھی ان کی تحریروں سے ان کی موضوع پر گرفت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ذات کا سچ) تاثرات (میں رقمطراز ہے---

"تیز دوڑتی اور چیختی ہوئی کاروں کے درمیان راستہ بناتے ہوئے میں اکثر سڑک پر رک کے حائل ہونے کی کوشش کر چکا ہوں لوگ میری کم حیثیتی کو جانے بغیر حریص منصفوں سے ڈرتے ہیں بہت سے لوگ کنگال ہونے کے خوف سے بے ہودہ گالیاں دے کر مجھے میرے پیچھے لگائے رکھتے ہیں۔

ان کی تحریروں میں توازن اور معروضیت پائی جاتی ہے وہ کسی بھی موضوع پر بات کرتے ہوئے تعصب سے گریز کرتے ہیں اور ٹھوس شواہد اور دلائل کی بنیاد پر اپنی بات پیش کرتے ہیں۔

کلیم خارجی کا مزاج اس کی نفسیاتی کیفیات اور کی سوچنے سمجھنے کا انداز آپ کے اسلوب پر اثر انداز ہوتے ہیں کیوں کہ ایک صاحب اسلوب کا شیوا ہوتا ہے کہ ذاتی زندگی کے تجربات، مشاہدات اور واقعات ان کے اسلوب کو نکھارتے ہیں۔ ہر دور کی اپنے تقاضے ہوتے ہیں جس سے ادیب اور تخلیق اپنے زمانے کے اثرات سے بچ نہیں سکتا یہی وجہ ہے کہ کلیم خارجی اپنے زمانے کے رنگ میں رنگا ہوا ہے۔

لطموس کی موت میں لکھتے ہیں ''اس کا ذہن بھوک، افلاس اور زندگی کے خوف کی وجہ سے تیزی سے کام کرنے لگا لوگوں کو دولت مند اور خوشحال دیکھ کر وہ انہیں یوں خوشامد سے دیکھتا اور مسکراتا جیسے وہ اپنی کا بچھڑا ہوا کوئی عزیز ہے جسے وہ پہچ نہیں رہے''

تخلیقی صلاحیتیں کسی ادیب یا تخلیق کو نئے اور منفرد انداز میں لکھنے کی ترغیب ملتی ہیں کلیم خارجی کی تخلیقی صلاحیتوں کی تو ایک جہاں قائل ہے مگر ان میں نمایاں وصف کہانی پن ہے جو بہت ہی کم افسانہ نگاروں کے ہاں یہ وصف ملتا ہے۔

اس ضمن میں گھٹیاں آدمی لطموس کی موت، فساد، عکس، چوں وغیرہ

نمائندہ افسانے ہیں کلیم خارجی کے اسلوب کا ایک نمایاں وصف قارئین کے ساتھ گہرا رابطہ اور تعلق بھی ہے وہ ہمیشہ قائم رکھتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

ڈاکٹر تیمور حسن تیمور (مرحوم) کی شاعری پر ایک نظر

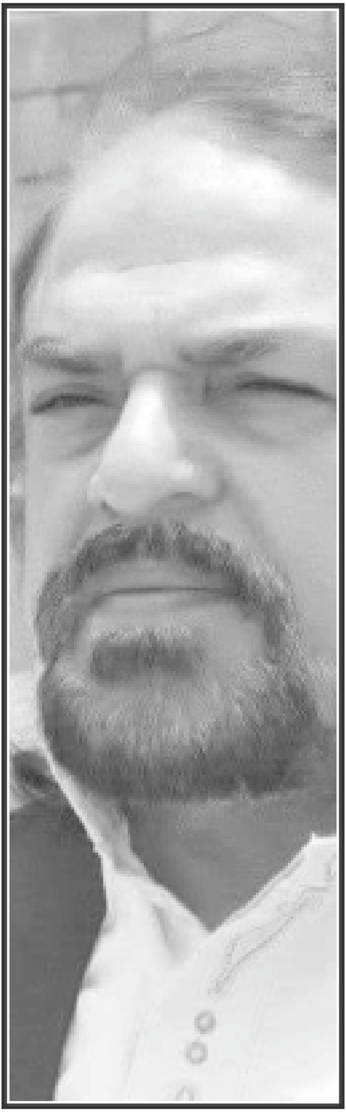

احمد ساقی

تیمور حسن تیمور (مرحوم) سے یاد اللہ تو کئی برسوں پر محیط تھی مگر ملاقات کا بہانہ اکثر محافلِ مشاعرہ ہی بنتیں۔ اس سے آخری ملاقات یونیورسٹی آف اوکاڑہ کے مشاعرے میں ہوئی۔ تیمور بلند آہنگ شاعر تھا اور اپنی اس بلند آہنگی سے مشاعرے بھی لوٹا کرتا تھا۔ جب وہ مشاعرہ پڑھتا تو یوں محسوس ہوتا کہ شعر کا مزاج بے ساختگی کے ساتھ خود نمایاں ہو رہا ہے۔ مشاعرہ پڑھنے کا انداز ایسا پرسوز اور بلند ہوتا کہ جیسے کوئی شخص دادرسی کے لیے دہائی دے رہا ہو یا ڈار سے بچھڑی ہوئی کوئی کونج ہجر کا گیت گا رہی ہو۔ سامعین پورے فہم کے ساتھ داد دینے پر مجبور ہو جاتے (وہ اپنے دوست شعرا سے ہنستے ہوئے کہا کرتا تھا کہ مشاعرے میں آدھی داد تو میں اپنی حلیے سے لے جاتا ہوں)

تیمور حسن تیمور کے دو شعری مجموعے ''غلط فہمی میں مت رہنا'' اور ''ترا کیا بنا'' کئی سال پہلے منصۂ شہود پر آئے اور اپنی مقبولیت اور پذیرائی کی بنا پر ان کے نئے ایڈیشنز بھی شائع ہو چکے ہیں۔

تیمور (مرحوم) نے مجھے ان دونوں کتب

کے نئے ایڈیشنز ارسال کرتے ہوئے اصرار کیا کہ میں اس کی شاعری پر بے باک تبصرہ کروں۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی شاعر کی سخن طرازی پر تبصرہ کرنا یا تنقیدی رائے دینا بہت ہی مشکل اور نازک کام ہے خاص طور پر اس شخص کے لیے جس کا انتقادیات سے دور کا بھی واسطہ نہ ہو اور پھر ایسے مستند شاعر پر جس کے بارے میں ڈاکٹر خورشید رضوی، ڈاکٹر تحسین فراقی اور امجد اسلام امجد مرحوم جیسے نابغہء روزگار نقاد اپنی آرا سے نوازتے ہوئے کہہ چکے ہوں کہ ”تیمور نادر الکلام شاعر ہے۔ اس کی ہر ایک غزل میں ایک آدھ نشتر نکل ہی آتا ہے لہٰذا اسے شاعری میں کسی رعایت کی ضرورت نہیں“۔ اس تناظر میں میرے لیے اس کی شاعری پر رائے دینا ہچکچاہٹ کا باعث بنا رہا بہرکیف ایفائے عہد کرتے ہوئے مبصرانہ رائے حاضر ہے۔

شعر کا تعلق حیاتِ انسانی سے ہے، یہ تخلیق ہوتا ہے، بولا اور سنا جاتا ہے۔ شعر ذہن کے ان خلیات سے ظہور پاتا ہے جو غیبی اشارے موصول کرتے ہیں، آپ انہیں ”الہامی ریسیور“ بھی کہہ سکتے ہیں جو ایک خاص کیفیت میں متحرک ہو کر ایک ردھم میں ڈھلتے ہوئے شعر کا روپ دھار لیتے ہیں۔ شاعر اپنی مرغوب جہات سے عنوانات کا انتخاب کرتا ہے اور اپنے مشاہدات اور تجربات کی آمیزش سے اسے میدان شعری میں اتار دیتا ہے۔

اگر ہم مجموعی طور پر شعری عمل کا جائزہ لیں تو ہم پر منکشف ہوگا کہ اچھا شاعر خاص شعری فضا میں نمودار ہوتا ہے۔ تیمور (مرحوم) بھی ان اچھے شعرا میں سے تھا جس نے اپنے لیے شعری نظام کے ذریعے خوب صورت فضا تشکیل دی جس میں رہ وہ شعر کہنے میں کوئی دقت محسوس نہیں کرتا۔

تیمور (مرحوم) نے اپنے شعری اظہاریے کے لیے شعر کی سب سے خوب صورت اور دلکش ہیئت کو، جو شعرائے اردو کی محبوب ہیئت ہے یعنی غزل کا انتخاب کیا۔ تیمور مرحوم نے غزل میں بھی زیادہ تر ان بحور کا انتخاب کیا جو زیادہ مترنم ہیں، ان مترنم بحروں میں سادہ بھی ہیں جن میں چست مصرع سازی ہنرمندی کی متقاضی ہے اور مرکب بھی ہیں جو لفظیات کی برجستگی مانگتی ہیں۔ تیمور (مرحوم) نے ان کے تمام تقاضوں کو حتی الامکان باحسن پورا کیا۔ ایسا لگتا ہے کہ بصارت کی محرومی نے تیمور کے اندر خارجی دنیا کے تمام پہلوؤں خواہ اس کا تعلق انسانی رویوں سے ہو یا فطرت سے، ایسا اجاگر کیا تھا کہ اکثر اصحاب بصارت ان پہلوؤں کو دیکھ نہیں

پاتے۔ اس کی شاعری پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم زندگی کے کچھ پہلوؤں کو اس زاویے سے نہیں دیکھ پائے جس زاویے سے تیمور نے دیکھا اور محسوس کیا۔

ڈاکٹر تیمور (مرحوم) کا شعری تجربہ یقیناً ہم سے مختلف تھا ہم شعر تخلیق کر کے فوراً لکھتے ہیں قطع و برید کرتے ہیں مگر تیمور ان مراحل میں یقیناً اپنے حافظے پر اعتماد کرتے ہوں گے جو اس کو قدرت کی طرف سے وافر ودیعت کیا گیا تھا۔ چونکہ مترنم بحروں میں کہے ہوئے اشعار جلد یاد ہو جاتے ہیں اس لیے تیمور نے ان کا سہارا لیا۔

ڈاکٹر تیمور حسن (مرحوم) نے اپنی شاعری میں لمبی اور منفرد ردیفوں کا استعمال بھی کثرت کیا جو کہ ہماری عام بول چال کا حصہ ہیں۔ اس کی بہت سی مثالیں دی جا سکتی ہیں ملاحظہ فرمائیں۔

خدا بہتر کرے گا، ترا کیا بنا، مجھے دکھ نہیں، بدل چکا ہے، میں چپ رہا، تو میں کیا کروں، کیسے ختم ہوگا، تجھے علم ہے، سمجھ رہا تھا، اسے کیا ملتا ہے، شہر کو بچا، سے نفرت ہے، بڑا گہرا ہے، نہیں کروں گا، تلا ہوا ہے، اسے خبر بھی تھی، کچھ بھی نہیں، تم خوش رہو، اسے پوچھنا۔۔ ایسی اور کئی ردیفیں آپ کو اس کی غزلیات میں ملیں گی جو روزمرہ کا حصہ ہیں۔

اصحاب فن کے نزدیک لمبی ردیف کو غزل کا حسن قرار نہیں دیا جاتا مگر تیمور (مرحوم) نے ان ردیفوں کو اتنی خوب صورتی سے برتا ہے کہ پوری غزل کے حسن کا انحصار ان ردیفوں کی طرف منتقل ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔

غزلیہ شاعری کئی پہلوؤں سے روایت سے متصل ہے اگر اسے روایت سے یکسر جدا کر دیا جائے تو یقیناً یہ اپنا حسن و جمال کھو دے گی۔ تیمور کا لہجہ اگرچہ جدید ہے مگر اس کا شعری مزاج روایت سے جڑا ہوا ہے۔ اس کی تراکیب اور لفظیات روایت کے مطابق ہیں مگر معنوی اخذ کئی مقامات پر بہت منفرد ہے اس کے تخیل کا جہان الگ ہے اس کا باعث اس کی ہیئت کذائی بھی ہو سکتی ہے۔ اس کی شاعری میں تخاطب، ترنم، اور تغزل نمایاں ہیں۔ اس کے موضوعات میں تنوع جگہ جگہ نظر آتا ہے۔ محبت اس کا مرکزی کینوس ہے جو اپنے لوازماتی رنگوں سے بھرا ہوا ہے۔۔ لیجیے میرے بیان کردہ قضایا کی روشنی میں ڈاکٹر تیمور حسن تیمور (مرحوم) کے کچھ خوب صورت اشعار ملاحظہ فرمائیں:

تجھے زندگی کا شعور تھا ترا کیا بنا
تو خوش کیوں ہے مجھے بتا ترا کیا بنا

میں مقابلے میں شریک تھا فقط اس لیے
کوئی آ کے مجھ سے یہ پوچھتا ترا کیا بنا

مجھے علم تھا کہ شکست میرا نصیب ہے
تو امیدوار تھا جیت کا، ترا کیا بنا

میں کہوں بھی کچھ نہ وہ رو پڑے تو میں کیا کروں
مری خامشی کو زباں ملے تو میں کیا کروں
مرے ہم نشیں مرے مسئلے کا تو حل بتا
مجھے اپنے آپ سے ڈر لگے تو میں کیا کروں
کئی بار وہ مری زد پہ آ کے بھی بچ گیا
کوئی اس کے حق میں دعا کرے تو میں کیا کروں

....

جنھیں عشق والوں کا مشورہ نہیں بھولتا
انھیں تیرگی میں بھی راستہ نہیں بھولتا
کبھی بھول جاتا ہوں زندگی پہ محیط بات
کبھی غیر اہم سا بھی واقعہ نہیں بھولتا
مرا ذہن جلتا ہے سوچ کر جسے دوستو
مجھے چاہ کر بھی وہ سانحہ نہیں بھولتا

....

مجھے چھوڑ کر جو چلا گیا اسے پوچھنا
کہ جوازِ ترکِ وفا ہے کیا؟ اسے پوچھنا
نہیں دے گا کوئی خبر تمہیں مرے حال کی
مگر ایک پیڑ بتائے گا اسے پوچھنا
مرے پاس کچھ بھی نہیں رہا یہ بجا مگر
مجھے چھوڑ کر اسے کیا ملا اسے پوچھنا

....

میں نے بخش دی تری کیوں خطا تجھے علم ہے
تجھے دی ہے کتنی کڑی سزا تجھے علم ہے

مندرجہ بالا اشعار کا وزن متفاعلن متفاعلن متفاعلن مسدس سالم ہے، اس بحر کے اشعار بغیر ردھم کے پڑھیں تو اپنا رنگ ڈھنگ کھو جاتے ہیں۔ اس بحر میں موسیقیت بلا کی ہے۔ آپ ان کی ردیفوں پر غور کریں تو معمول سے کچھ لمبی دکھائی دیتی ہیں مگر تیمور (مرحوم) نے جس احسن انداز میں انھیں نبھایا ہے واہ واہ کیا کہنے۔

درج ذیل اشعار کی بحر پر بھی غور فرمائیں:

مجھے بظاہر نہیں لگا تھا بدل چکا ہے
مگر چھٹی حس نے پھر بتایا بدل چکا ہے

....

جو صدیوں پہلے تھی اب بھی تیمور وہ گھٹن ہے
میں کیسے مانوں کہ اب زمانہ بدل چکا ہے

....

اذیتوں کا یہ سلسلہ کیسے ختم ہو گا
دماغ کا دل سے معرکہ کیسے ختم ہو گا
ہر ایک ظالم تھکا ہوا ہے یہ سوچتا ہوں
مزاحمت کا یہ سلسلہ کیسے ختم ہو گا

....

وہ عشق کو باعثِ اذیت سمجھ رہا تھا
میں اس اذیت کو اک عبادت سمجھ رہا تھا
کسی کے جانے کے بعد مجھ پر کھلی حقیقت
لگاؤ تھا میں جسے محبت سمجھ رہا تھا

....

نہ قرب کے پل نہ ہجر لمحوں کا سامنا ہے
اب اہلِ دل کو نئے تقاضوں کا سامنا ہے
ترے بچھڑنے پہ پوچھتے ہیں زمانے والے
بچھڑنے والے مجھے سوالوں کا سامنا ہے

تو میرے بیچ خدا مری رہنمائی فرما
قدم قدم پر مجھے خداؤں کا سامنا ہے

....

نہیں اڑاؤں گا خاک، رویا نہیں کروں گا
کروں گا میں عشق پر تماشا نہیں کروں گا
اگر کسی مصلحت میں پیچھے ہٹا ہوں تیمور
تو مت سمجھنا پلٹ کے حملہ نہیں کروں گا

....

خموش کیوں ہوں اگر وہ یہ بھی نہیں سمجھتا
زباں سے کہہ دوں میں یہ ضروری نہیں سمجھتا
مری نظر میں یہ اس سے آگے کی کوئی شے ہے
میں زندگی کو فقط کہانی نہیں سمجھتا
وہ اپنے آقا کی ساری باتوں کو مانتا ہے
ستم تو یہ ہے اسے غلامی نہیں سمجھتا
سمجھ میں آتا ہے سب کی جو ہو رہا ہے تیمور
مگر یہ کیوں ہو رہا ہے کوئی نہیں سمجھتا

....

اب اپنے ماضی کو مارنے پر تلا ہوا ہوں
میں اک نیا روپ دھارنے پر تلا ہوا ہوں
مجھے خبر ہے کہ میری چادر بڑی نہیں ہے
میں پاؤں پھر بھی پسارنے پر تلا ہوا ہوں

....

درج بالا اشعار- مفاعلاتن مفاعلاتن مفاعلاتن کے وزن پر ہیں یہ بھی مسدس سالم ہے اور موسیقیت سے بھری ہوئی بحر ہے ان اشعار کو بھی بغیر ردھم کے پڑھنا نثر میں بدلنے کے مترادف ہے۔ اسی ردھم میں اور کئی غزلیں "غلط فہمی میں مت رہنا" میں موجود ہیں۔

ایسی بحور میں شعر کہتے ہوئے مجھ پر منکشف ہوا کہ ان کی لفظیات و تراکیب دوسری بحور سے مختلف ہیں یہ بھی یاد رہے کہ لفظیات بدلتی ہیں تو موضوعات و مضامین بھی بدلتے ہیں، بقول غلام حسین ساجد "غیر مستعملہ یا کم کم استعمال میں لائی جانے والی بحروں میں شعر کہنے سے موضوعات میں تنوع آتا ہے ہر بحر کا اپنا مزاج ہوتا ہے" درج بالا بحور میں تغزل کا عنصر غالب نظر آتا ہے

مزید کچھ اشعار دیکھئے:

محبت کا اثر ہوگا غلط فہمی میں مت رہنا
وہ بدلے گا چلن اپنا غلط فہمی میں مت رہنا
تسلی بھی اسے دینا یہ ممکن ہے میں لوٹ آؤں
مگر یہ بھی اسے کہنا غلط فہمی میں مت رہنا

....

زخم خوردہ کی دعا تم خوش رہو
تم رہو نغمہ سرا تم خوش رہو
ایک دن بے نام خط مجھ کو ملا
جس پہ یہ تحریر تھا تم خوش رہو

....

بددعاؤں کا دعاؤں کا مزہ لیتا ہوں
میں تو لوگوں کے رویوں کا مزہ لیتا ہوں

حیرت چشم سمٹ آتی ہے لہجے میں ترے
تیرے لہجے سے میں آنکھوں کا مزہ لیتا ہوں

....

اس شعر میں جس عمدگی سے شاعر نے ضمناً اپنی محرومیءِ بصارت کا ذکر کیا ہے اس کا جواب نہیں۔

....

شکر کر تیرا محبت میں گیا کچھ بھی نہیں
ورنہ یاں ایسے بھی ہیں جن کا بچا کچھ بھی نہیں
کر دیا اس کو ودیعت خامشی نے یہ ہنر
بات کہہ جاتا ہے ساری بولتا کچھ بھی نہیں

....

بچھڑ کے روتا رہوں گا اسے خبر بھی تھی
یہ دکھ میں سہہ نہ سکوں گا اسے خبر بھی تھی
جھجک رہا تھا وہ کیوں مجھ پہ وار کرتے ہوئے
میں انتقام نہ لوں گا اسے خبر بھی تھی

....

وفا کا ذکر جب چھڑا میں چپ رہا
سبھی نے کچھ نہ کچھ کہا میں چپ رہا
کبھی لگا تھا چپ رہوں تو ٹھیک ہے
اور اب لگے یہ کیا کیا ، میں چپ رہا
اب اس لیے گھرا ہوا ہوں آگ میں
کہ جب کسی کا گھر جلا میں چپ رہا

....

ایسی مشکل اور لمبی ردیفوں کو جس انداز میں تیمور نے نبھایا ہے طبیعت عش عش کر اٹھتی ہے۔

تیمور (مرحوم) کے کچھ اور خوبصورت اشعار جن کی لطافت طبیعت کو سرشار کرنے کی پوری صلاحیت رکھتی ہے۔ شاعری کی کامیابی اس بات میں مضمر ہے کہ وہ قاری کو ایک خوشگوار حیرت میں مبتلا کر دے

ملاحظہ فرمائیں:

شب کٹ گئی ہے یہ کہیں جھوٹی خبر نہ ہو
سورج کا جاگنا بھی فریب نظر نہ ہو
میں ایسا کیا کروں کہ تجھے سب پتا چلے
میں ایسا کیا کروں کہ جہاں کو خبر نہ ہو
لگتا ہے اس میں کوئی زمانے کی چال ہے
تیمور ورنہ عشق ہو اور کارگر نہ ہو

....

تصور کیجئے یہ اس شاعر کا شعر ہے جو بصارت سے محروم ہے، پڑھ کر کلیجہ منہ کو آتا ہے اور پسیج جاتا۔

میرے بیٹے میں تجھے دوست سمجھنے لگا ہوں
تم بڑے ہو کے مجھے دنیا دکھانا مرے دوست
تم کو معلوم تو ہے مجھ پہ جو گزری تیمور
پوچھ کر مجھ سے ضروری ہے رلانا مرے دوست

....

یہ تحمل تو مجھے عشق نے بخشا تیمور
ورنہ تلوار اٹھانے کا ارادہ تھا مرا

....

تمام عمر یہ عقدہ نہ کھل سکا مجھ پر
کہ نقش ادھورے ہیں یا آئنے ادھورے ہیں

....

وہ مرصع ہے کہ سادہ ہے بڑا گہرا ہے
شعر تاثیر جو رکھتا ہے بڑا گہرا ہے
آنکھ میں ٹھہرے ہوئے پانی سے اندازہ ہوا
دل کا دریا، بڑا گہرا ہے، بڑا گہرا ہے
پڑھ کے سادہ سی عبارت بڑی مشکل میں ہوں
تو نے جو خط مجھے لکھا ہے بڑا گہرا ہے

....

میری خواہش ہے دکھاؤں اسے دل کی دنیا
اس نے پوچھا ہے محبت تجھے کیا دیتی ہے
تیرے لہجے میں جو مضبوطی ہے تیمور حسن
تیرے اندر کے کسی ڈر کا پتا دیتی ہے

....

یوں آج کی یہ ملاقات یادگار بنا
گئے دنوں کی کسی بات کا حوالہ دے

....

چن لیا جاتا تجھے کارِ محبت کے لیے
اتنی اچھی سگِ دنیا تری قسمت نہیں تھی
کس لیے قابلِ نفرت تجھے سمجھا دنیا
قابلِ رحم تھی تو قابلِ نفرت نہیں تھی

....

میں جو اپنے حال سے واقف نہیں
میرے مستقبل کا اندازہ کرو

....

مری بھی چھاؤں نہ ہوتی اگر تمھاری طرح
میں انحصار بزرگوں کے سائے پر کرتا

....

میں ایک بار پھر اس بات پر شرمندگی کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکتا کاش یہ مضمون ڈاکٹر تیمور حسن تیمور کی زندگی میں لکھا ہوتا مگر موت پر کسی کا زور نہیں، جہاں بھی اس شذرے میں تیمور کے ذکر میں "ہے" کی جگہ "تھا" لکھا جگر تھام کے لکھا، سانس کا اعتبار کہاں۔ میں نے ایک بار کہا تھا

زندگی موت کنارے سے لگی رہتی ہے
اب تو ہر سانس پہ لگتا ہے کہ ٹوٹا ٹوٹا
اب مرے جسم کے اعضا بھی ہیں بدلے بدلے
اب تو یہ دل بھی مجھے لگتا ہے روٹھا روٹھا

مضمون لکھتے ہوئے بار بار تیمور مرے سامنے آیا اور اپنا یہ شعر سناتے ہوئے رلا گیا۔

میں ہوں راشد کا وہی اندھا کباڑی تیمور
جس کے خوابوں کا یہاں کوئی خریدار نہ تھا

ہر انسان کو جہانِ فانی سے جانا ہی ہے۔ رب کائنات کا فرمان ہے:

(ترجمہ) "اس ذات خداوندی کے علاوہ ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے۔" اس لیے ہر شخص، بشمول ہمارے ملکِ عدم کی طرف رواں دواں ہیں لیکن جو لوگ کسی بھی میدان میں اپنا قابلِ قدر اثاثہ چھوڑ جاتے ہیں وہ رہتی دنیا تک یاد رکھے جاتے ہیں۔ ان شاء اللہ ڈاکٹر تیمور حسن تیمور (مرحوم) بھی اپنی شاعری کے ذریعے جب تک دنیا قائم ہے زندہ رہے گا۔

ان شاء اللہ تعالیٰ

☆☆☆☆☆

جاندار کہانی کی خالق ...... ثمینہ سیّد

ثمینہ سید کا تعلق پاکپتن سے ہے لیکن لاہور سے بی اے کیا- ایم اے اردو کیا ایم ایڈ کیا- درس وتدریس سے سرکاری طور پہ منسلک ہیں- ایم فل اور پی ایچ ڈی اردو ہیں-- دو بچے ہیں جنھیں شوہر کی وفات کے بعد بہترین تعلیم دلائی اور کامیاب بنایا- چھ کتابیں چھپ چکی ہیں- مزید کام جاری ہے- کہانی سفر میں ہے کے افسانوں پہ بات کرتے ہیں-

کہانی کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنا کہ انسان- جب ایک انسان نے اپنے دکھ سکھ میں دوسرے انسان کو شریک کرنا چاہا تو اسے زبان کا سہارا لینا پڑا اور پھر قلم کی ایجاد نے زبان کی جگہ لے لی اور خوب لی کہ زبان سے ادا شدہ لفظ ، سننے والا ، کچھ بھی سمجھ سکتا ہے لیکن لکھا ہوا لفظ تو تبدیل نہیں ہوسکتا- میں یہاں کہانی یا افسانے کی تاریخ بیان نہیں کروں گا کہ اس پر بہت کچھ اور بہت اعلیٰ پیمانے پر لکھا جا چکا ہے اس لئے افسانوں کی اس کتاب کی طرف آوں گا جو حال ہی میں مجھے پڑھنے کو ملی-

" کہانی سفر میں ہے " اس میں اٹھارہ کہانیاں ہیں- یہ افسانے تکنیکی اعتبار سے بیانیہ ہیں لیکن کہیں کہیں کرداروں کا ڈوب کر مطالعہ کرنے کی دعوت بھی دیتے ہیں-

کہانی کے اس سفر میں سماجی اور معاشرتی زندگی کی جھلکیاں ہی نہیں آج کا سارا سماج اور معاشرت نظر آتی ہے کیونکہ یہ ہمارے معاشرے کی جیتی جاگتی تصویریں اور زندہ حقائق ہیں - ان کہانیوں میں معاشرتی رویوں کی ناہمواریوں کا کینوس خاصا وسیع نظر آتا ہے- زمانے کی ہوس ناکی کا نشانہ بنا انسان اندر ہی اندر کہاں کہاں مرتا اور ٹوٹتا ہے، عزت اور شرافت کا بھرم رکھنے کے لیے وہ کن اذیتوں سے گزرتا ہے، اس سب کی ایک قبیح صورت ہے ان کہانیوں میں- یوں محسوس ہوتا ہے کہ افسانہ نگار خود بھی ان کہانیوں کا کوئی کردار ہے-

ان افسانوں کے موضوعات میں گھر، گھر کے ماحول، تعلق داریوں، انسانی ہمدردی

راشد جاوید احمد

اور خلوص کے جذبوں کی بھی تفصیل ملتی ہے۔ عداوتیں ہیں، رقابتیں ہیں، جن کا رشتہ کہیں معاشی مسائل سے ہے تو کہیں سماجی بے راہ روی سے۔ ذمہ داریوں اور پریشانیوں کے بوجھ تلے دبے ہوئے گھر، متوسط طبقے کی خواتین اور ان کے مسائل ان افسانوں کے بنیادی موضوعات ہیں۔ حقیقی زندگی، تلخ تجربات اور ایک عام انسان کی روز مرہ مشکلات مصنف کی فکری رو کے ساتھ بندھی ہوئی نظر آتی ہیں۔

ثمینہ سید اپنے اردگرد میں ہر طرف قول و فعل میں تضاد دیکھتی ہیں تو بے یقینی اور بداعتمادی کے پھوٹتے سوتے، انہیں کچھ سوچنے اور پھر سوچ کو تحریر میں ڈھالنے پر مجبور کرتے ہیں۔ وہ اس کا کھلم کھلا اظہار بھی کرتی ہیں لیکن چونکہ وہ اس سسٹم کو تبدیل نہیں کر سکتیں، اس لیے مجھے یقین ہے کہ وہ کہانی لکھنے کے بعد نڈھال بھی ضرور ہوتی ہوں گی۔ سماج میں ناہمواری اور بے اعتدالی کا جنم تب ہوتا ہے جب ہر طرح کی صورت حال کو ہمارا اجتماعی طرز احساس قبول کرتا رہتا ہے، ایک افسانہ نگار یا ادیب اس سے لاتعلق نہیں رہ سکتا تو پھر وہ ایسی کہانیوں کی تخلیق میں پناہ ڈھونڈتا ہے جو اس مجموعے میں ہیں۔ ثمینہ سید کی ان کہانیوں میں ان متضاد رویوں کی بازگشت بہت بلند آواز میں سنائی دیتی ہے جو ہماری معاشرتی زندگی کو دیمک کی مانند چاٹ رہے ہیں۔ ان کہانیوں کا سماج، جائے پناہ نہیں، جائے عبرت ہے۔

ان کہانیوں کے کردار تخیلاتی نہیں بل کہ اسی زمین سے تعلق رکھتے ہیں اور اپنی تمام تر خوبیوں اور خامیوں سمیت جلوہ گر ہیں۔ کہانیوں کی ڈکشن سادہ مگر پراثر ہے۔ ''ہم کہاں کے سچے تھے''، میں طاہرہ، ''دوغلی''، ہاتھ میرے خالی، ''رنگ رسیا'' افسانہ نگار کے شعور اور مشاہدے کی عکاس کہانیاں ہیں۔ ''گوٹے والا سوٹ'' اور ''خوشیاں نئی شال'' اس مجموعے کی بہترین کہانیاں ہیں۔

میں خود افسانہ لکھنے کی مشق کر رہا ہوں تاہم یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ثمینہ سید کو اپنی اگلے افسانوی مجموعے کے لیے کچھ نئے موضوعات پر توجہ دینا چاہیے اور تحریر میں کچھ، مقصد، کچھ احتجاج کا عنصر شامل کرنا چاہیے تاکہ وہ کہانی کے اس سفر میں، ریگستان میں چلتے چلتے پانی کے سراب میں صحرا میں نہ بھٹک جائیں۔ وہ اپنے منفرد طرز تحریر اور طاقتور قلم سے ایسی کہانیاں تخلیق کر سکتی ہیں جو قاری کے لیے گواہی اور شہادت کا مقام رکھیں۔ یہ جاندار کہانیاں لکھتی رہیں۔۔ نیک خواہشات

☆☆☆☆☆

”غم ورثہ ہے“ [ناولٹ]

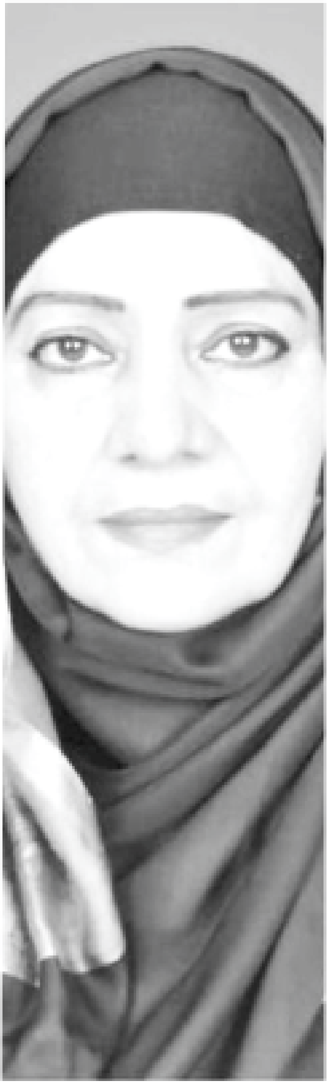

دردانہ نوشین خان

کتابیں جھاڑ کر رکھتی ثانیہ نے حیرت سے اُسے دیکھا۔

”انسان ہوں ناں...... جب زندگی کو دیکھتی ہوں تو زندہ رہنے کی خواہش سر اٹھانے لگتی ہے۔“

”تم ایسا کرو بی اے کا کورس منگا لو......“

”ایف اے، بی اے، ایم اے...... اس کا فائدہ؟ رہنا ڈنگر کے ساتھ اور آگہی میں اضافہ کرتے جانا...... برین ٹیومر کو دعوت دینا۔“

وجدان کی پیدائش اور چھلہ خدمات کرواتے ہنسی خوشی گزر گیا، ایک بار پھر تحفوں کی بھرمار کے ساتھ ثمینہ کو اپنی گاڑی میں اُس کے ٹھکانے پر پہنچا دیا گیا۔

طویل عدم موجودگی کی وجہ سے اُس کا کمرہ کوڑا کرکٹ کے ڈھیر میں بدل چکا تھا۔ اُس کی آمد کی اطلاع کے باوجود کمرے کو جوں کا توں رکھ کر اُسے نظرانداز کیا گیا۔ میلی چادریں، چکنے چیکٹ غلاف تکیے، پلنگوں کے نیچے دھکیلے ہوئے چھلکوں کے شاپر، سالن کی سنی ہوئی تھالیاں سنگھار میز پر داغ دھبے، تیل کے نشان، سگرٹ کی ڈبیا، ثمینہ نے تجو ماسی کی چارپائی کے ساتھ کپڑا باندھ کر جھولا بنایا بچے کو اس میں ڈالا جسے تجو ماسی لیٹے لیٹے ہلاتی رہی، کمرے میں آئی، دوپٹہ اُتار کر

ایک طرف رکھا اور صفائی پر جُت گئی۔ مغرب تک ڈھلائی والی مشین چلتی رہی۔ رات کو فارغ ہوئی۔ گھر سے لایا گیا کھانا سب نے مزے لے کر کھایا تحائف کی تقسیم ہوئی۔ اُس کی لائی مٹھائی کے ٹوکرے سے دادی بجو نے بستی میں پوتے کی پیدائش کی مٹھائی بانٹی۔ مجید کی عید وشبرات شروع ہوگئی۔

روزانہ نوکری پہ جانے سے پہلے وجدان کی فیڈر دھوکر اُبال کر ماسی بجو کو دے جاتی۔ واپسی پر وہ فیڈر بار بار استعمال ہونے کے بعد کہیں گرے پڑے ملتے، کچھ کہنے پر یہی سننے کو ملتا۔ ”بچے پل جاتے ہیں، ہمارے بھی پل گئے۔“

وجدان چھ ماہ کا تھا۔ چھٹی کا دن تھا۔ ناشتے سے فارغ ہوکر وہ کمرے کے پیچھے گودام والی کوٹھڑی کی صفائی پر لگ گئی۔ ابھی اندر گئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ اُس کی چیخ سنائی دی۔

”بھابی کیا ہوا، نوید دوڑا۔“

ثمینہ کو سانپ نے ڈس لیا تھا۔ نوید نے سانپ دیکھ لیا اور مار بھی ڈالا۔ نوید نے ثمینہ بھابی کے سانپ ڈسے پاؤں کے اوپر کس کر دوپٹہ باندھا موٹر سائیکل پہ پیچھے مجید ثمینہ کو سنبھال کر بیٹھا۔ نوید بنیادی طبی امداد سنٹر پہ لے آیا۔ اُنھوں نے فوراً بڑے ہسپتال ریفر کیا۔ مگر مجید اُسے گھر لے آیا اور کسی سپیرے کو بلوانے نوید کو بھیج دیا۔ ثمینہ پر جُوں جُوں غنودگی چھا رہی تھی۔ اُس کے میکے اطلاع کر دی گئی تھی۔ گلے میں منکوں کا ہار

ڈالے، کالا تھیلا لٹکائے سپیرا آیا سارا گاؤں اکٹھا ہوگیا جیسے مسیحا آگیا ہو۔ سپیرا آگ پہ چاقو تپا رہا تھا کہ آندھی طوفان کی رفتار سے گاڑی بھگاتے نذر محمد، اظہر، مظہر، ثانیہ اور علیشا پہنچے۔ ثانیہ نے ڈاکٹر کی ہدایات کردہ گولیاں گھول کر مُنہ میں ڈالی انجکشن لگایا، ڈرپ لگائی (وہ میڈیکل کی طالبہ تھی)

اظہر نے مجید کو پہلی بار خوب لتاڑا ”ہم نے تمھیں اپنی بہن مار دینے کے لیے نہیں دی۔ جاہل، عقل کے دُشمن“ ...... مظہر نے گاؤں کے بچوں سے وجدان کو لیا۔ اور وہ ثمینہ کو لے کر گاڑی میں واپس روانہ ہوگئے۔

علیشا کو پتا ہی نہ چلا کہ وہ چلے گئے ہیں۔ ”کیا چلے گئے“ وہ دروازے تک جا کر جھانکی، علیشا نے رونا دھونا ڈال دیا۔ اُسے کیوں چھوڑ گئے۔ چاچی نے کہا ”اڑی دھی فکر نہ کر...... تری بھابی کو کب تک بٹھائیں گے“

بجو ماسی نے کہا ”بٹھانا کیا ہے...... یہ تو پہنچتے تک مر جائے گی، آدھے راستے چل جائے بڑی بات ہے۔“

مجید نے دانت نکالے کندھے اچکائے، اُس کی ماں بجو بھی ایسے ہنسنے لگی جیسے پہلے سے جانتی ہو۔ یہ بات لطیفہ نہ تھی مگر وہ ہنس رہے تھے۔ صرف نوید کے چہرے پر سمجھ نہ آنے والی کیفیت تھی۔

اللہ کا کرم ہوگیا کہ ثمینہ موت کے مُنہ سے نکل آئی۔ ثانیہ نہ پہنچتی تو اُس نے مر جانا تھا۔ اُس کی

کسمپرسی کی چشم دید گواہی نے گھر والوں کی آنکھیں کھول دیں...... اُس کی بغیر تنخواہ طویل چھٹی بھجوادی گئی۔ یرقان کا حملہ ہو گیا تھا۔ تین ماہ تک سنجیدگی سے علاج ہوتا رہا۔ اس دوران مجید کا دو تین بار فون آیا۔ نذر محمد نے بے اعتنائی برتی۔

ثمینہ کی تندرستی کے بعد نذر محمد نے اپنے گھر میں ایک کمرہ اور واش روم بنوا کر ثمینہ اور اُس کے بچوں کو آباد کر لیا۔ لگتا تھا باپ کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔

ثمینہ ایف اے کی تیاری کرنے لگی۔ وہ پھر سے جی اُٹھی۔ بیماری کے اثرات اور مایوسی اُڑنچھو ہو گئی۔ وہ اپنا خیال رکھنے لگی۔ اُس کے پاس پیسے نہیں ہوتے تھے اس نے پرائیویٹ ہسپتال میں نرس کی جاب کر لی۔ مجید ایک بار آیا تھا ثمینہ بچوں کو لے کر چھپ گئی تھی۔

اُدھر علیشا کا کالج چھوٹ گیا۔

شہری زندگی کا نشہ، بس پر کالج آنا جانا، کلاس فیلوز سے دوستیاں، ٹی وی ڈراموں کی باتیں، موبائل وائی فائی میسر ہونا، اور سب سے بڑھ کر اظہر کی دل پشوریاں خواب بن گئی تھیں۔

وہ اظہر کو کسی نہ کسی طرح اُداسی۔ ہجر و فراق کے سندیسے بھجواتی رہتی تھی۔ اظہر بھی مسلسل ابا اماں کو کہتا رہتا کہ علیشا کا تو اس معاملے میں کوئی قصور نہ تھا اُسے واپس لے آئیں۔

پھر ایک دن مجید، بجو ماسی، علیشا اور اُس کا مخبوط الحواس باپ بچوں کو ملنے کے بہانے پہنچ گئے۔ پہلی بار (مجید کی شادی کے آٹھ سال بعد) وہ اپنی بساط بھر تحفے بھی لائے، جیسے گڑ، شکر، چاولوں کا آٹا، ریوڑیاں، پنجیری، ساگ وغیرہ۔ علیشا آتے ہی بڑے عفان کو گلے سے چمٹا کر آنسو بہانے لگے۔

بجو ماسی چھوٹے وجدان کو پکڑ پکڑ کر گود میں لیتی وہ نکل نکل جاتا۔ مجید اچپ دائیں بائیں دیکھ رہا تھا اُس کا باپ پہلے تو ٹھُس ٹھُس کرکے روتا رہا پھر اُٹھا اور نذر کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ ہاتھ جوڑ کر رقت سے بولا۔

''بھرا نذر محمد (بھائی نذر محمد) میرے بندھے ہاتھ دیکھو...... میرا سفید سر دیکھ۔ میری چٹی سفید داڑھی کی لاج رکھ لے۔ جو قصور ہم سے ہوئے میں معافی مانگتا ہوں...... میری نُوں (بہو) اور پوتوں کو گھر بھیج اپنا گھر آکر آباد کریں...... تم کہو تو مجیدا اور ثمینہ بے شاک الگ گھر لے لیں ثمینہ دھی کو نوکری وہاں مل جائے گی...... اب غصہ تھوک دے''

وقفہ پا کر بجو ماسی گویا ہوئی

''اس طرح تو زندگی نہیں گزرتی بھرجائی راحت...... ثمینہ دو بچوں کی ماں ہے...... ساری حیاتی لماں ابا کے گوڈے کے ساتھ تو نہیں بیٹھی رہے گی...... مویا سپ (منحوس سانپ) ہماری خوشیاں کھا گیا......''

وہ بول چکے تو نذر محمد نے کہا:

''میری بیٹی کی طرف دیکھو۔ اس کی صحت کیا

تھی کیا حالت تھی۔

اب اس کی صحت دیکھو..... تم نے اسے بے آسرا وسیلہ سمجھ لیا تھا۔ غریب تو تھے بے حس بھی تھے، یہ یہاں خوش ہے۔ ایف اے کی تیاری کر رہی ہے آگے پڑھے گی۔''

''پڑھے پڑھے..... ضرور پڑھے..... بے شک پڑھے ہم کیوں روکیں گے۔''

وہ تینوں بیک زبان بولے۔

''او میرا نواسہ عفان انگریزی سکول میں پڑھ رہا ہے۔ قاری اس کو قرآن پاک کا سبق دینے آتا ہے۔ یہ بچے گاؤں میں نہیں رہ سکتے۔''

راحت بی بی نے نذر محمد کی بات میں اضافہ کرتے ہوئے کہا

''سچو! وہاں کیا ہے؟ کچے کوٹھے سانپ بچھو نہ صفائی نہ ستھرائی چیتے میلے باہر اُتنے اندر سے..... تم لوگوں کو تو میٹھا بولنا بھی نہیں آتا بندے خود سانپ بچھو ہیں۔''

''بھائی..... ہم بھی انسان ہیں، میٹھا بولنے والے نہ ہوتے تو یہ علیشا روز عفان وجدان کو یاد کر کے روتی..... سانپ بچھو کچے گھروں سے بھی نکل آتے..... ایک حادثہ تھا ہو گیا۔''

''ہاں جی..... روز تو سانپ نہیں نکلتے، مجید نے دلیل دی۔ بحث نے طول کھینچا۔ آخر گیند ثمینہ کے کورٹ میں ڈال دی گئی۔

''اس سے پوچھ لو۔ یہ مجید کے ساتھ جاتی ہے تو میں راضی، جو اس کی مرضی ہو۔''

''میری مرضی؟'' ثمینہ کے سوال میں حیرت ہی ہیں جہان طنز بھی تھا (جیسے ابّا کو معلوم نہیں میری مرضی کیا تھی کیا ہے) نذر محمد سر کھجانے لگا مجید نے عفان کو کھینچ کر گود میں چڑھا لیا۔

''ابو کے پاس تو آ و یار..... ابو کو نظم سناؤ''

یہ نظم نہیں Pome کہتا ہے'' اظہر بولا تو علیشا بالوں کی لٹ انگلی پر لپیٹتے ہوئے بولی ''کیسے ہیں آپ؟''

اظہر مسکراہٹ چھپاتا پانی پینے لگا۔ اُس کے انگ انگ میں آج ترنگ تھی۔

ماں نے ثمینہ کو الگ کمرے میں بلایا ''بیٹھو بیٹی''

''مجھے معلوم ہے آپ نے مجھے کیوں بلایا ہے۔ دلائل نہ دیں فیصلہ سنائیں۔''

''اس طرح مت سوچو ثمینہ۔ تم ہی مسئلے کا حل بتاؤ۔ طلاق وہ نہیں دیتا پہلے بھی ہی کہتا تھا اب بھی.....''

ثمینہ فرش پر پاؤں سے لکیریں کھینچتی رہی.....

''انھیں الگ گھر کا کہہ دیں؟ بڈھا الگ گھر کا کہہ تو رہا ہے۔ بچے تو ہم نہیں بھیجیں گے۔ تم ایف اے کے بعد نرسنگ کا سال بھر والا کورس کر لینا۔ سرکاری ہسپتال تحصیل میں جاب ہو جائے۔''

''نہ دکھائیں خواب، نفرت ہے مجھے خوابوں سے، مجھے الگ گھر نہیں چاہیے..... مجھے مجیدا پسند نہیں ہے الگ گھر میں وہ ہی سر پر مسلط ہو گا۔ مجھے کیا فرق پڑے گا۔''

ماں کو چپ لگ گئی ماں بیٹی میں سے کسی کے پاس کوئی لفظ نہ تھے۔ اتنے میں ابا داخل ہوئے۔

”بتا رہا کہ ہے کمرہ سیمنٹ کرا کے سفیدی کرا دی ہے۔ صحن کا آدھا فرش پکا کرا لیا ہے۔ سٹور کو خالی کر کے اس میں کھڑکی لگا دی ہے۔ صفائی کرا دی ہے۔ باقی جو ہم کہیں گے کرا دیں گے...... میں بیٹی کو ایک مہینے کے لیے شرط پر بھیج رہا ہوں کہ اسے کوئی شکایت نہ ہو“

”بچوں کو میں نہیں بھیجوں گی یہیں پڑھیں گے“ ماں نے ابا کے فیصلے پر مہر لگائی۔

پھر وہ ثمینہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگے

”شادی شدہ بیٹی کو بغیر فیصلے کے ہم کب تک بٹھا سکتے ہیں۔ آج وہ منت کر رہے ہیں۔ ہر بات منظور کر رہے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کل ہمیں منت کرنی پڑے۔ یہ کمرہ تمھارا ہے تمھارا رہے گا...... جتنے دن آؤ رہو۔“

”ابا کی ٹھنڈی مار سے سر اُٹھانا ممکن نہ تھا، ثمینہ کو ہتھیار ڈالنا ہی تھے۔

زندگی ضرور آگے چلی ہو گی ثمینہ پیچھے لوٹ آئی۔ گاؤں میں کچھ نہیں بدلا تھا ویسے بھی گاؤں جلدی بدلتے ہیں نہ گاؤں والے۔ مجیدے کی محبت یہی تھی کہ دن میں کئی بار کمرے کا دروازہ بند ہوتا اور کھلتا رہتا۔ لہجہ، الفاظ، رویّہ اور بندہ وہی تھا۔

ایک مہینے کے اندر ثمینہ نے پھٹی ایڑیوں، بھدّے ناخنوں اور سانولے چہرے والی محنت کش دیہاتن کا روپ دھار لیا۔ وہ اب پہلے سے بھی زیادہ اداس رہتی تھی۔ اُس نے ایک بار پھر اچھے دن گزار کر دیکھے تھے۔ اُس کی بہن ثانیہ میڈیکل کالج میں پڑھ رہی تھی۔ وہ اُجلی لڑکیوں، مہذب رویئے، فیشن کے لباس، جدید جوک ز، ویڈیوز، دورِ حاضر کے مروجہ مباحثے، ان سب کا حصہ رہی تھی رہنا چاہتی تھی۔ تعلیم یافتہ، شائستہ، خوش لباس ہم خیال جیون ساتھی کا سپنا اُس کے اندر مرتا نہ تھا۔ اپنا خود مختار گھر، اپنے بچے اپنے پاس، جاب پر جانے والا باشعور شوہر یہی کچھ وہ چاہتی تھی۔ اُس کو دولت کی حسرت نہ تھی۔ اُس کے سپنے اسی آمدنی میں سما سکتے تھے۔

جو زندگی وہ بسر کر رہی تھی اُسے لگتا وہ حرام کاری ہے اس لیے تو مجیدا اُسے حرام زادی کہتا اور اُسے اب اپنا نام ہی حرام زادی لگتا۔

وجدان کے بعد شامہ اور شامہ کے بعد امامہ اُس کی گود میں آ گئیں۔ دونوں بچیاں دو سال کے فرق سے پیدا ہوئیں۔ گاؤں کی دائی نسیمو نے پیدا کرائیں۔ وہ اپنی ہر ضد ہار چکی تھی۔ اب اُسے اپنے جسم کی بدنمائی کی پرواہ نہیں رہی تھی۔ شامہ اور امامہ کے رُل کے پلنے کی کڑھن نہ رہی تھی۔ وہ اپنے ماں باپ سے مکمل مایوس ہو چکی تھی۔ اب اُسے وہاں جا کر رہنے، بہار کے جھونکے لینے۔ پیزا برگر کھانے، شاپنگ پر اپنی ماں، بہن اور علیشا کے ساتھ خود ”شودی“ محسوس

کرانے، ہر نئی چیز کو جان کر نقلی ہنسی ہنسنے پر ترقی پر اوپری مبارکباد دینے کی ہمت نہ رہی تھی۔

نذر محمد سترھویں گریڈ کی نوکری سے ریٹائرڈ ہوا۔ یک مشت خاصی رقم ملی۔ اظہر اور علیشا کی شادی شان و شوکت سے کی گئی۔ وہ ہاتھوں کی پڑھائی لاڈلی بہو تھی۔ جہیز بھی خود بنایا۔ اس کے باوجود علیشا کی ماں سجو ماسی کہتی اُن کو سوہنی سجل پڑھی لکھی مفت میں مل گئی جب کہ بدلے میں انھیں معمولی صورت کم پڑھی ثمینہ ملی۔

وجوہات کو پس پشت ڈال کر نظر آنے والے حقائق یہی تھے نذر محمد کی بہو اعلیٰ تعلیم یافتہ سمارٹ جدید ''لڑکی'' تھی۔ سجو کی بہو اکھڑ زبان، پرانے ڈھنگ کے کپڑے پہننے والی ''عورت'' تھی۔ یہ عورت اُس لڑکی سے کچھ ہی مہینے بڑی تھی۔

شادی پر پیسے کی ریل پیل دیکھ کر سجو نے مجیدے کو سمجھایا کہ ثمینہ باپ کو ملنے والے پیسوں سے اپنا حصہ مانگے۔ ثمینہ کے انکار پر وہی گالم گلوچ،...... ''بکواس نہ کر۔ میں تجھے ویگن میں بٹھا آتا ہوں۔ پرسوں اتوار کو واپس آجانا۔''

مجیدے کی گالیوں اور تھپڑ سے اُس نے ڈرنا چھوڑ دیا تھا۔ جواب بہت تھے اور دے سکتی تھی مگر جانے کیا سوچ کر چھوٹی امامہ کی چند چیزیں سمیٹیں۔ شامہ کو دادی کے پاس چھوڑ کر وہ چل پڑی۔

ثمینہ کو بچی اُٹھائے یوں اچانک سامنے پا کر وہ ایک دفعہ پھر حیران و پریشان ہو گئے۔

''تم نے بتایا نہیں کہ تم آرہی ہو ہم گاڑی لے آتے'' اظہر بولا

''ارے واہ...... ثمینہ بھابی آئی ہیں۔'' کچن سے جو سر آف کر کے علیشا جھانکی۔ ملازم نے واشنگ مشین چلا رکھی تھی۔ ''زندگی تو میرے بغیر یہاں خوب رواں ہے۔''

''کیسی ہیں آپ ثمینہ بھابی'' جوس کا گلاس احترام سے پیش کرتے ہوئے جینز شرٹ والی علیشا نے عرض کیا۔ ''علیشا بھابی...... میں اُتنی ٹھیک ہوں جتنا کوئی آپ کے میکے میں ہو سکتا ہے اور آپ اُتنی ٹھیک ہیں جتنا کوئی میرے میکے میں ہو سکتا ہے۔''

ثمینہ نے چھکا مارا۔

آمدم بر سر مطلب ثمینہ نے اپنا سوال پٹاری سے نکالا۔

''مجھے آپ کے داماد نے بھیجا ہے۔ ابا کو ریٹائرمنٹ کے بعد کتنی رقم ملی ہے؟''

اور اب آیا ثمینہ کو اصل مزہ جب ابا مجھ سے اُکھڑ کر بولے۔

''اُس نے یہ سوچا کیونکر ہے۔ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔''

''آپ آرام سے بیٹھ تو جائیں' امی وہی سدا کی راحت ہی راحت

''آرام سے بیٹھ گیا ہوں...... لو...... ابھی میں نے دو بچوں کی شادی کرنا ہے۔ اللہ نصیب

کرے ہم حج کر آئیں۔ میں یہ پونجی بانٹ نہیں سکتا۔ اگر ایک کو حصہ دوں تو دوسروں کا بھی حق ہے۔"

"ابا...... یہ سارے جواب آپ اپنی پیاری بہو کے بھائی کو دیں۔" اُس نے ناشتے کی ٹرے کھسکا کر اپنے سامنے رکھی۔

نذر محمد نے فون اٹھا لیا۔ اُن کے طیش سے پتا چل رہا تھا مجید سے بات ہو رہی ہے۔ اُدھر اظہر دبے دبے لفظوں میں روکتا مبادا بات بگڑی تو ثمینہ پھر سے یہاں بیٹھ سکتی ہے۔ یہ فکرمندی کم و بیش گھر کے ہر فرد کو تھی۔ عفان اور وجدان سکول سے آئے بھاگتے ہوئے ثمینہ کو ملے۔ ثمینہ نے دونوں کو دائیں بائیں لپٹا لیا۔ جلد ہی وہ اپنے معمولات میں مگن ہو گئے۔ امامہ انھیں گندی بچی لگی۔

ایک رات ثمینہ کو بسر کرنا تھی۔ امی اپنے بستر میں بیٹھی ثمینہ کے نصیبوں پر ملال کر رہی تھیں۔ امامہ کو سلاتی ثمینہ نے پوچھا۔

"امی...... شامہ مجھے یاد نہیں کرتی"

"اُسے تمھاری شادی کو لے کر ابھی تک غصہ ہے"

"اُسے کہو مٹی ڈالے جیسے میں ڈال چکی" اُس کی ہنسی میں ہمیشہ درد ہوتا تھا۔

"مجید کو جا کر کیا کہو گی؟"

"مجھے اب کیا کہنا ہے۔ ابا کہہ چکے ہیں۔ اُسے جواب مل چکا ہے"

"مگر وہ چپ تو رہنے والا نہیں"

"اُس کی بکی ہوئی گالیاں مجھے چپک نہیں جاتی۔ اُس کی نیکیاں مجھے شفٹ ہوتی رہتی ہیں بشرطیکہ نیکیاں ہوں ورنہ میرے گناہ اُسے شفٹ ہوں گے۔"

"یہ تو اللہ کے معاملے ہیں"

"معاملے تو سارے ہی اللہ کے ہوتے ہیں۔"

اظہر بھائی کمرے میں آ کر بیٹھا تھا اور کہا "اب مجیدے کی مجال نہیں تمھیں کچھ کہے۔ اُسکی بہن ہے ہمارے گھر، ترا بھائی زندہ ہے۔ کچھ کہے گا تو اُس کی بہن کو نکال باہر کروں گا۔"

ثمینہ زور سے ہنسی "مجھے تو وہ حرام زادی کے سوا کچھ بلاتا نہیں۔ ابھی علیشا کو حرام زادی کہہ کر بلانا ذرا...... وہ اسی طرح لاجواب کر دیا کرتی تھی۔

"شامہ کو کیوں نہیں لائی ہو" وہ بات بدل گیا۔

"میرے بچے اسی طرح بٹے ہوئے ہیں۔ مل جائیں گے جیسے کیسے"

خیر پور جنوبی کے بس سٹاپ پر ثمینہ گود میں بچی کو فیڈر دیے خیالوں میں گم بیٹھی تھی۔ اُسے گھر جانے کی جلدی نہ تھی بس ایک کشش تھی کہ وہاں شامہ اُس کی راہ دیکھتی ہو گی۔ مگر ایک بدنما سوا گت اُس کا منتظر ہو گا۔ زبان سے نکلا

"کہاں سے ملتا ہے کالا پتھر"

"جی...... کالا پتھر" کوئی تھا جس نے اُس کی

خود کلامی سن لی تھی۔ کالا پتھر کے حوالے سے
خبریں پڑھتا ہوگا ایک اور خبر بننے جا رہی ہے
سوچا ہوگا۔
"آپ پریشان ہیں بی بی؟" وہ
ثمینہ نے جلدی سے آنکھیں صاف کیں اُس
پر نظر ڈالی۔
"آپ دیہی مرکز صحت پر ہوتی ہیں؟" وہ
پہچان گیا تھا چھوٹا سا تو علاقہ تھا پھر ذہن پر
زور ڈال کر یاد کرتے ہوئے کہا۔
"ثمینہ میڈم، آپ کسی کا انتظار کر رہی ہیں؟"
"نہیں، میں گھر جا رہی ہوں ابھی بس سے
اُتری ہوں"
"میں شہریار جویہ وکیل ہوں۔ بھابی کے ساتھ
ایک بار سنٹر آیا تھا"
"اس تعارف کی ضرورت نہیں ہے" اُس نے
بچی کو اُٹھایا، بیگ کاندھے پر لٹکایا اور چل دی۔
وہ اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا مگر اُسے جاتا دیکھتا رہا
شاید اُسے ڈر تھا وہ کالا پتھر نہ تلاش کر لے۔
ثمینہ گھر میں داخل ہوئی۔ تجو ماسی چٹائی پر
سرسوں کے ساگ اور پالک کا انبار لیے کاٹ
رہی تھی۔ مجید اور نوید ایک ہی پلیٹ سے
سویوں کا زردہ کھا رہے تھے۔ تین سالہ شامہ
مٹی میلی کپڑوں اور گندے ہاتھوں سے اُن کی
گود اور پلیٹ پر گری پڑتی تھی۔
ثمینہ نے سلام کے بعد امامہ کو بٹھا کر شامہ کو
اُٹھا لیا "گندی بچی...... ترے منہ پر ستھری

جگہ نہیں ملتی جہاں پپی کروں، چلو منہ دھلاؤں
تمھارا" وہ اُسے لے کر اندر چلی گئی۔ شامہ کا
حلیہ درست کر کے موزے جوتے پہنا رہی تھی
کہ مجید اندر آ گیا۔
"آتے ہی کس کام میں لگ گئی ہو۔ روٹی شوٹی
کھاؤ۔ حال دو"
"حال تو فون پر سن لیا تھا۔"
"فون تو کیا تھا نذر ما ے نے...... مگر میں سمجھا نہیں"
ثمینہ نے بستر کی چادر جھاڑتے ہوئے دیکھا
"کیا نہیں سمجھا"
"تم اپنی ماں سے بات کر کے سمجھاتی"
"کیا سمجھاتی"
"حرام زادی...... تو بیٹھ کے بات نہیں
کر سکتی۔"
"پیسے میری ماں کے نہیں آئے ابا کے آئے
تھے۔ ابا کا جواب سن لیا تم نے"
"تری غریبی پہ ترے باپ کو ترس نہیں آتا۔
مجھے پیسے دے گا میں کوئی کاروبار کر لوں گا۔
اُس کی بیٹی سکھی رہے گی۔"
امامہ کے رونے پر وہ امامہ کی طرف بڑھی تو
بازو سے کھینچ کر روکا
"پہلے میری بات کا جواب دے۔ یہ کتورے
روتے رہتے ہیں۔"
"تو سنو...... ابا کو میرے اوپر ترس آتا تو وہ
میری تم سے شادی نہ کرتے۔
البتہ میرے باپ نے تمھاری بہن کو اعلیٰ تعلیم دلوا

کر اس کا خود جہیز بنا کر شان و شوکت سے شادی کر کے عیش و آرام میں رکھا ہوا ہے..... اب تمھارا باپ یا تم مجھے یہ سب کچھ مہیا کرو۔ دونوں طرف کا ذمہ میرا باپ نہیں ہے۔''

''ابا کی لگتی...... وہاں اکے میرے خلاف بھونکی ہوگی۔ تری زبان کسی دن ٹوکے مشین میں دے دوں گا۔''

باہر سے سوماسی نے روٹی کھانے کی آواز دی تو مجیدا چیخا۔

''کوئی روٹی نہ دوا سے۔ روٹی بند ہوگی تو مت آئے گی۔ مفت کی روٹیاں توڑنا آسان ہے۔''

''مفت کی روٹیاں میں نہیں توڑتی۔ میں کما کر کھاتی اور کھلاتی ہوں۔

8 کیلے زمین تمھارے ابا کی ہے۔ وہ کیوں نہیں دو بھائیوں میں تقسیم کر دیتا تا کہ تم بھی جانو کے محنت کیا ہے۔''

''کنجری، بے شرم گھٹیا عورت۔ جب بولتی ہے خاوند کی بے عزتی کرتی ہے''

چٹیا سے پکڑ کر سر پہ کس کے تھپڑ مارے اور کہا ''لے تو اسی قابل ہے''

بچیاں رونے لگیں۔ شور بڑھتا پا کر جو ماسی اور نوید آئے۔ نوید مجید کو بازو سے پکڑ کر کمرے سے کھینچ نکال لے گیا۔

اب ثمینہ دونوں بچیوں کو دائیں بائیں گھٹنوں پہ لے کر زمین پر بیٹھ رہی۔ ہاتھوں کی لرزش قابو میں نہ آتی تھی منہ پر بکھری لٹیں لرزتے ہاتھ سے سمیٹی اور کانوں کے پیچھے اڑستی تھی۔

''چل بس کر...... نیچے نہ بیٹھ، بُرا شگون ہوتا ہے۔''

سجو ماسی کا دلاسہ بھی اشتعال دلانے والا ہوتا۔

''ہاں ہاں میں بیوہ ہوگئی ہوں۔ یتیم لے کے زمین پہ بیٹھی ہوں۔ آمین۔

''تُو بیچ پہ مار کھاتی ہے۔ بولتے ہوئے آؤ دیکھتی ہے نہ تاؤ...... میرے جوان شہتیر پتر کو کھائے گی۔ ترا باپ نہ مر جائے۔''

''سب کے باپ...... سب کے خاوند مر جائیں...... یہ شہتیر ہے تو اس کے بغیر چھت اچھی......'' ثمینہ نے من ٹھنڈا کر لیا تھا اب جو جتنا چلائے اس کی جوتی کو پرواہ...... وہ اٹھی اور باورچی خانے چلی گئی۔

دن خواہ کتوں کی طرح لڑتے بھونکتے گزرا ہو رات کو مجیدا جانور کی طرح حق وصولنے آجاتا۔ اُسے مجیدے سے مار کھانے سے اتنی نفرت نہ تھی جتنی اُس کے قریب آنے سے ہوتی۔ اگر ماں شمامہ امامہ کو بھی رکھ لے وہ دریا میں چھلانگ لگا کر میکے سسرال کو کتی دے جائے۔

وہ مرکز دیہی صحت میں بیٹھی تھی۔ چوکیدار ہی خاکروب تھا۔ شریف بندہ تھا۔ میزیں کرسیاں جھاڑتا، جھاڑو لگاتا۔ باہر چھڑکاؤ کرتا۔ پھر باہر بیٹھ کر راہگیروں سے گپ شپ لگاتا۔

دفتر میں رکھے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ثمینہ نے فون اُٹھایا۔

"ثمینہ باجی..... بول رہی ہو"

"ثم ثانیہ....."

"ہاں میں ثانیہ ہوں" (یہ سننا بھی خوشی تھا خوشی جس کو ثمینہ کی زندگی ترس گئی تھی)

"ثانی..... خیریت تو ہے نا....."

"ہاں ہاں سب خیریت ہے میں اپنے ہاسٹل سے بات کر رہی ہوں۔ پرسوں تم امی کی طرف گئی تھی تم نے امی سے کہا ثانیہ مجھے یاد نہیں کرتی۔ تمھیں کیا معلوم..... ثانیہ جب تمھیں یاد کرنے لگتی ہے تو بھول جاتی ہے کہ کلاس روم ہے۔ لیب ہے یا سڑک پر چل رہی ہوں۔ مجھے تمھاری سب حالتوں کا پتا ہوتا ہے..... مگر میں سوچتی ہوں تم سے کیا بات کروں۔ اصل بات کو ادھر اُدھر کی باتوں سے ٹرخانا مجھے نہیں آتا..... میں تمھارے جتنی صابر اور کمپوز نہیں ہوں۔

"اب میں چپ نہیں رہتی۔ ایسی بکواس بھی نہ کروں کہ میرا کلیجہ پھٹ جائے، کچھ زندگیاں اس لیے بنائی جاتی ہیں کہ تماشا گاہ سلامت رہے۔

پھر ثانیہ نے کہا کہ وہ اس کو پیسے دے سکتی ہے اگر اُسے پیسے کی ضرورت ہے اس پر ثمینہ نے پوچھا۔

"تمھارے پاس اس وقت کوئی ہے تو نہیں؟"

"نہیں میں اکیلی ہوں"

"ایک بات کہوں"

"ہاں بولو..... جتنی بڑی بات کہنی ہے کہہ دو"

"میرا جینے کو دل نہیں کرتا"

"مجھے یہی ڈر تھا..... کبھی ایسا مت کرنا۔ کبھی ایسا مت سوچنا....."

"میرے نہ ہونے سے کسی کو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ میرے بیٹے میرے بغیر اچھے رہ رہے ہیں۔ کسی طرح بچیوں کو وہیں بھیج دوں۔ بس ایک ہی رکاوٹ ہے۔"

"ثمینہ..... تمھاری زندگی تمھارے لیے ہے۔ تم اپنے لیے ہو۔ دُنیا اور آخرت بندہ اپنی آپ جیتا ہے....." وہ رونے لگی "تم نے اگر خودکشی کی تو میں بھی خودکشی کر لوں گی۔ ماں باپ کو دکھا دوں گی انھوں نے کچھ نہیں پایا"

"پیاری ثانی..... ترے پاس مرنے کا کیا جواز ہے۔ تجھ پہ ابا نے کوئی ظلم نہیں کیا۔ تجھ پہ خرچ کر کے پڑھا رہے ہیں..... اور جو تم مجھے کہہ رہی ہو میں اپنے لیے جیوں..... میں اگر نوکری پہ نہ آتی تو منہ دھونے کی ضرورت ہوتی نہ فرصت۔ اچھا اب فون رکھتی ہوں ڈاکٹر صاحب آ رہے ہیں۔

ثانی..... تمھاری آواز نے تازہ ہوا کی کھڑکی کھولی ہے"

"بات کرتی رہوں گی۔ میں تمھیں موبائل خرید کر کسی بھی طرح بھیجوں گی"

اللہ حافظ۔

[جاری ہے۔]

ناشاعری کا یومِ حساب

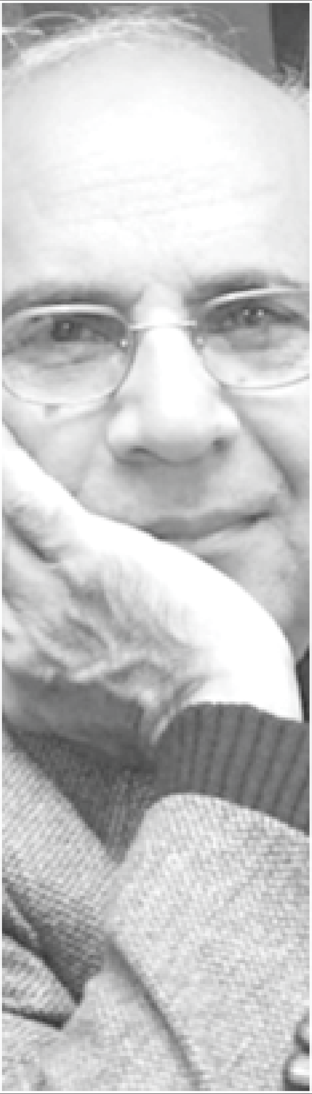

کیسا حرف و ہنر کا کھاتا تھا
کچی پکی سی چند سطروں پہ
جو بھی عنواں کوئی جماتا تھا
شہر میں نظم گو قبیلے کا
وہ بھی اک فرد سمجھا جاتا تھا
شوقیہ پڑھنے سننے والوں سے
داد و تحسیں سمیٹ لاتا تھا
وقت کتنا بدل گیا دیکھو
اپنی تازہ کسی نگارش پہ
قسمیں کھا کھا کے اب وہ کہتا ہے
ایک اک لفظ اس کا اپنا ہے
پر کوئی مان کر نہیں دیتا
سب مکمل یقیں سے کہتے ہیں
اِس قدر بھی کب اُس کے بس کا ہے
یہ کسی ایپ کا کرشمہ ہے!

جلیل عالی

نظم

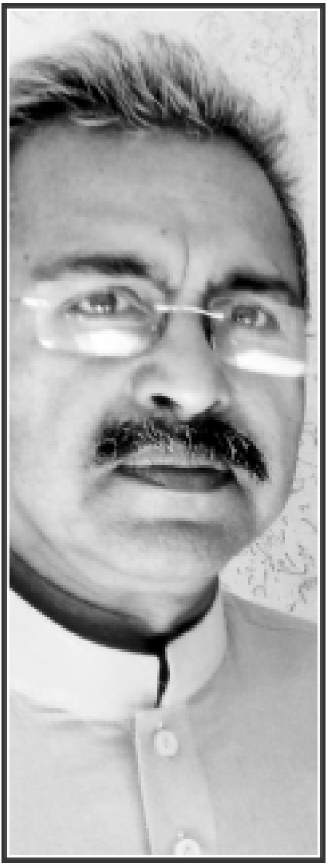

یومِ آزادی مبارک!!!!!!

گردابوں سے

مچھلیوں کے جبڑوں تک

آنے کی مہلت کو

آپ اگر آزادی کہتے ہیں

تو آزادی کا جشن منائیں

یومِ آزادی مبارک

راحت سرحدی

------------- انتخاب -------------

- خالد احمد -

نجمِ غم راہ دکھاتا ہے اسی بستی کی
اسی بستی میں اسیرانِ وفا رہتے ہیں

-------- نعمان منظور --------

وہ اور مَیں

سیّد افسر ساجد

وہ چاند چاند تصور
مَیں رات رات سفر
وہ دشت دشت تحیر
مَیں بات بات خبر
وہ حرف حرف تکلّم
مَیں ضبط ضبط نظر
وہ خواب خواب تخیّل
مَیں تار تار سحر
وہ موج موج ترنم
مَیں آب آب گُہر
وہ باس باس تبسّم
مَیں شاخ شاخ شجر
وہ نقش نقش تلاطم
مَیں آنچ آنچ شرر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

تن اپنی گرد میں پنہاں، دل اپنی موج میں گم
شکستہ جاں نہیں خالد شکستہ پائی میں

آزادی کے سورج کے نام

صبحِ آزادی کے سورج!
میں نے وہ منظر نہیں دیکھا
جب صدیاں شب بھر کا سفر ہو جاتی ہیں
جب چہرے سورج کی پہلی کرن پہ کھل اُٹھتے ہیں
جب بارش کا قطرہ گہر میں ڈھل جاتا ہے

میں نے وہ منظر نہیں دیکھا
جب جسموں سے لہو بہا، شہ رگیں کٹیں
جب آنکھیں ویران ہوئیں، مانگیں اجڑیں
جب شعلوں نے زندہ بچ رہنے کی ہر امید مٹا دی
جب ماؤں نے اپنے جواں بیٹوں کو
خاک پہ لوٹتے دیکھا
جب مرنے والوں نے پانی کے اک
گھونٹ کی خواہش کی
جب گلیوں، بازاروں، کھلیانوں میں
موت نے رقص کیا

میں نے وہ منظر نہیں دیکھا
جب دل میں صادق جذبے کی کونپل پھوٹے
جب نعروں کی گونج دلوں میں عزم کی
جوت جگا دے
جب ہر فردِ واحد پیکرِ کوہِ گراں بن جائے
جب بے پُرسان و بے گھر ہونے کا غم
راحت بن جائے
جب آنکھیں مدّت سے، بچھڑے
ہوؤں سے مل کر نم ہو جائیں

صبحِ آزادی کے سورج!
میں نے یہ سب کچھ نہیں دیکھا
لیکن مجھے خبر ہے
یہ سب کچھ تیری خاطر تھا
بامِ فلک سے تیری ایک جھلک کی خاطر
اس سج دھج کی خاطر

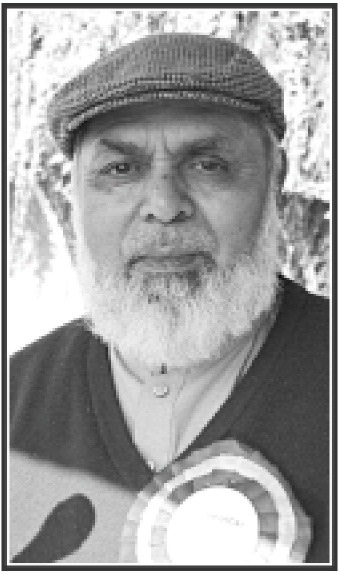

محمد انیس انصاری

اور جب......

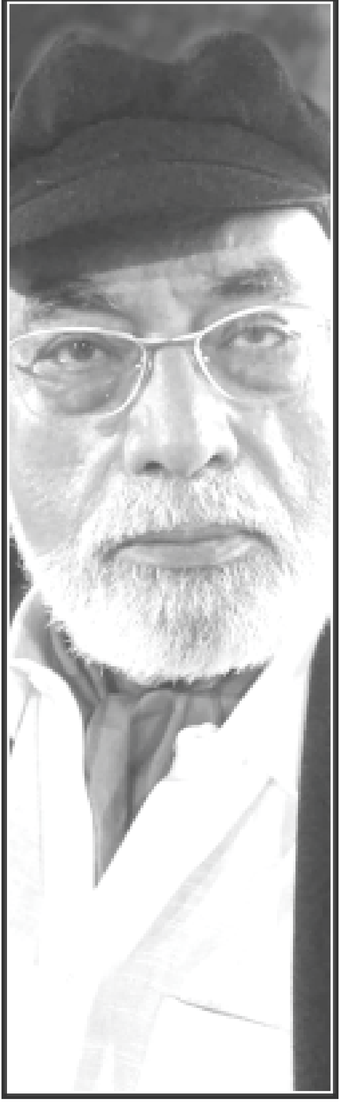

اور جب خواب ، لڑکھڑانے لگیں
نیند کی سرد ہوتی راکھ تلے
بنا تعبیر ہی ٹھکانے لگیں

یادیں بے چہرگی پہ ہوں مائل
چشم و دل ، پر غبار و لاطائل
عزم و امید ، موج بے ساحل

ہر ارادہ ہو ، کشتہ کاہش
جوں کھڑی فصل روند دے بارش
ڈوبی کشتی ، لگے جو ہر خواہش

ایسے میں ، کیا جواز جینے کا
کام دل ہو نہ جب قرینے کا
جل اُٹھے ، داغ داغ سینے کا

طارق بٹ

دھوکا

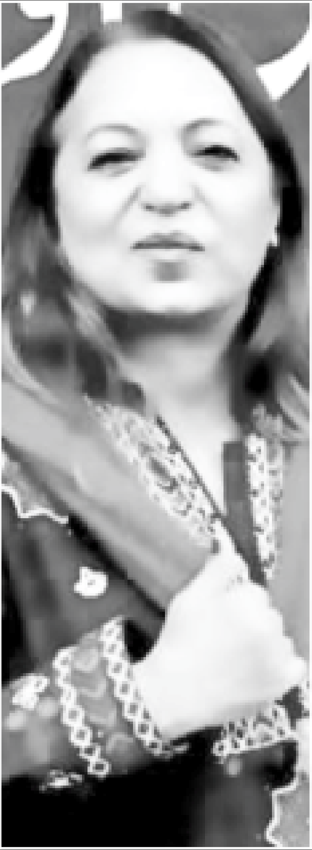

ٹائی کی ناٹ کو باندھنا

میں نے سیکھ لیا

سیکھ لیا ہے

کافی کو اپنے ہاتھوں سے بلینڈ کرنا

سگریٹ

ڈرے بنا اب میں سُلگا

سکتی ہوں

اب بولو میں پاس تمھارے آسکتی ہوں؟

آسکتی ہوں

کیا پھر دھوکا کھا سکتی ہوں؟

رخشندہ نوید

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہر رنج تری عطا تھا خالد
ہر دکھ اک در بے بہا تھا

شام

دریا ، ساحل ، پنچھی ، شام
سونا رستہ ، سونی شام

دن کو ملنے ، آئیں یار
بیتے لیکن ، پھیکی شام

من پر بھاری ، منظر دو
ڈھلتا سورج ، ڈھلتی شام

یادوں کا پھر دیپ جلا
کیسے اب گزرے گی ، شام

دھوپ کی شدت، اب توبہ!
جلتا دن ہے، جلتی شام

چاند کے پیکر والے لوگ
کیسے جانیں ، کالی شام

کاسب کو معلوم کہاں؟
کیسا دن اور کیسی شام ؟

دور افق پر تارے ہیں
رفتہ رفتہ ، پچھلی شام

کاش کے ! پھر سے لوٹ آئے
شوکت ، وہ وصلت کی شام

شوکت محمود شوکت

ہوا سندیس لائی ہے!

تسنیم کوثر

مرے گاؤں کے پنگھٹ پر
پرانے پیڑ کے نیچے
مری سکھیاں جب آتی تھیں
چہکتی، مسکراتی تھیں

وہ پنگھٹ آہیں بھرتا ہے
وہ لمحے یاد کرتا ہے

وہ بیری جس کی شاخوں پر
جھلتے گرم موسم میں
میں پینگ اپنی بڑھاتی تھی
ذرا سا ڈر بھی جاتی تھی
وہ بیری آج اکیلی ہے
کوئی سنگی، نہ بیلی ہے

اسی شاداب گلشن میں
جہاں موسم مہکتے تھے
فضائیں مسکراتی تھیں
تو چڑیاں چہچہاتی تھیں
وہ گلشن آج خالی ہے
کوئی چڑیا نہ مالی ہے!

بڑے شیطان کی رمی

پُل پہ چڑھتے ہوئے
میں نے گتھلی کو کھولا
ستاروں بھرے آسماں کے تلے کل جو کنکر چنے
اُن کو پھر سے گِنا
سات پورے کیے
بے خیالی میں چلتے ہوئے ساتوں کو
ہاتھ سے باری باری ٹٹولا۔۔۔

تقدس کی چادر سنبھالے ہوئے
میں مقابل ہُوا
تو اُدھر سے بھی کوئی مقابل ہُوا
میں نے پتھر سنبھالا
تو اُس نے بھی ہاتھوں میں پتھر کو تولا
ہنسا۔۔

وہ ڈری سی ہنسی
میں نے اپنے بھی چہرے پہ محسوس کی۔۔۔

میں نے ڈرتے ہُوئے
اُس نے ہنستے ہُوئے
دونوں جانب سے ایک ایک پتھر اُچھالا
رمی ہو چکی۔۔۔
آئنہ توڑ ڈالا!

منظر اعجاز منظر

جو کارواں سرِ بطحا ٹھہر گئے ہوتے

جو کر کے نور سے صرفِ نظر گئے ہوتے
کسی نشیب میں ہم بھی اتر گئے ہوتے

میں سوچتا ہوں کہ ہم بھی حسین مولا کو
جو نامے لکھ کے بلاتے، مکر گئے ہوتے؟

قسم خدا کی بڑا حوصلہ ملا دل کو
علی علی جو نہ کرتے تو مر گئے ہوتے

یزیدیت کے سوا اور راستہ کیا تھا؟
حسینیت جو نہ ہوتی کدھر گئے ہوتے؟

اگر نہ ہوتا کہیں یادِ کربلا کا ساتھ
تو جتنا ظلم تھا دنیا میں ڈر گئے ہوتے

وہ کربلا تھی سو دعویٰ نہ کیجیے صاحب
خدا ہی جانتا ہے ہم کدھر گئے ہوتے

نہ آندھیوں کے جو رستے میں کربلا پڑتی
یہ پھول پتے ہیں جتنے بکھر گئے ہوتے

قسم خدا کی ہمیں بھی وہ حر بنا دیتے
جو در پہ شاہ کے با چشمِ تر گئے ہوتے

یہ گرد گرد در و بام دل کی بستی کے
برستا غم کا جو بادل، نکھر گئے ہوتے

تو بات بڑھتی نہ آگے طوافِ کعبہ سے
جو کارواں سرِ بطحا ٹھہر گئے ہوتے

صدا تو آتی کبھی دھڑکنوں کی سینوں سے
جو دل نہ آلِ محمد سے بھر گئے ہوتے

کہاں یزید کو مجرم شمار کرتا کوئی
جو کوبہ کو نہ شہیدوں کے سر گئے ہوتے

حسین کرب و بلا میں سبھی کو لے آتے
وگرنہ سارے منافق مکر گئے ہوتے

علمدار حسین

زندگی

زندگی کیا ہے میرے یار نہ پوچھ
اس کا کتنا ہے اعتبار نہ پوچھ

شعلہ بنتی ہے کیسے چنگاری
کیسے جلتا ہے یہ شرار نہ پوچھ

کیوں خزاؤں کا بول بالا ہے
کیوں نہ آئی کبھی بہار نہ پوچھ

کس کے تلووں کو چاٹتی ہے یہ
کس پہ ہوتی ہے یہ سوار نہ پوچھ

رہ گیا کون ہاتھ ملتے ہوئے
کس کو کرتی ہے یہ شکار نہ پوچھ

کس کی قربانی رائیگاں ٹھہری
کون اس پر ہوا نثار نہ پوچھ

کیسے چلتا ہے آج دنیا میں
زندگانی کا کاروبار نہ پوچھ

کون اس کی حدوں سے باہر ہے
کس پہ ہے اس کو اختیار نہ پوچھ

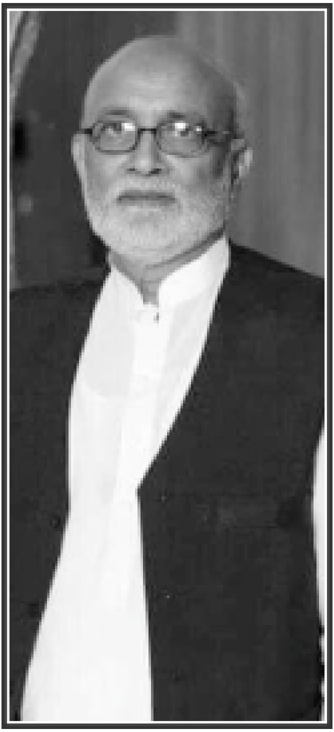

محمد افضال انجم

''زندگی''

سانسوں کی اس رو میں،
بس یہی ایک لمحے کا فاصلہ ہے
تمہارے اور ہمارے بیچ
تم دعویٰ کرتے ہو جینے کا،
ہم زعم رکھتے ہیں محسوس کرنے کا،
مگر بتلاؤ
کیا کبھی تم نے زندگی کو
چھو کے دیکھا ہے؟
کیا اس کی تھکن،
اس کی تپش،
اس کی نمی کو محسوس کیا ہے؟
وقت تو بس بہتے دریا کا نام ہے
کب رنگ بدل لے، کوئی نہیں جانتا
سفید، سیاہ ہو جائے؛
زر، خاک ہو جائے؛
لباس، ریزہ ریزہ
اور آنکھوں کا خواب،
ایک آن میں راکھ ہو جائے!

کبھی عشق لاحاصل رہتا ہے،
کبھی بے سبب، حاصل ہو جاتا ہے؛
اور زندگی؟
وہ پل میں موت کی چادر اوڑھ لیتی ہے!
پھر بھی تم،
ہتھیلی کی ان لکیروں میں قسمت
ڈھونڈتے ہو؟
کب سمجھو گے،
لکیریں راستہ نہیں، صرف نقشِ فریب ہیں؟
کب تک فانی دنیا کے پیار میں
خود کو کھپاتے رہو گے؟
کب ایک بار
زندگی کو ویسے چاہو گے
جیسے وہ تمہیں چاہتی ہے
بے غرض، خاموش اور مکمل

شبیر آکاش

نظم

ہے تجسس اس میں ہی انجام کا
گر نہ ہو شدت تو غم کس کام کا

تیرا ہونے کی سزائیں کاٹ لیں
مستحق ہوں اب ترے انعام کا

زندگی میں اپنی جب ہیں شب ہی شب
کیا کروں آئینۂ ایام کا

ابتدائے عشق جس میں تھی ہوئی
ذائقہ کچھ اور تھا اس شام کا

خط میں لکھا کچھ نہ تھا تھا داغ اک
طرز یہ بھی اس کے تھا پیغام کا

ہنستی آنکھوں سے چھلک جانا وہ اشک
کچھ تو مطلب ہوگا اس ابہام کا

عشق کو دنیا سمجھ پائی نہ جو
فن ہے یہ دیوانۂ گلفام کا

کامیابی کی طلب میں ڈوب کر
بھول بیٹھا نام ہی آرام کا

دیکھ اخبار و رسائل تو کبھی
نام کتنا ہے ترے بدنام کا

آہ زاری کر کے سینہ پیٹ کے
کیوں تماشہ میں کروں آلام کا

ذکی طارق

”ہجر محبت کی تکمیل ہے“

مدت ہو گئی ہے

تم سے بچھڑے

اب تو تم یاد بھی کم ہی آتے ہو

تعلق فراموشی کی آخری حد سے تجاوز کر چکا ہے

محبت کے مرقد پر اب یاد کا دیا نہیں جلتا

اپنا آپ ادھورا ہو کر بھی مکمل لگتا ہے

بادل چاند ہوا جگنو خوشبو رنگ اور برسات

من میں اجالا کیے رکھتے ہیں

کھو کر میں نے تمہیں مکمل پا لیا ہے

ہجر محبت کی تکمیل ہے“

نائلہ راٹھور

انتخاب

— خالد احمد —

نعمان منظور

ہم نے تجھے بے وفا کہا تھا
یہ کرب بھی ہم نے ہی سہا تھا

نظم

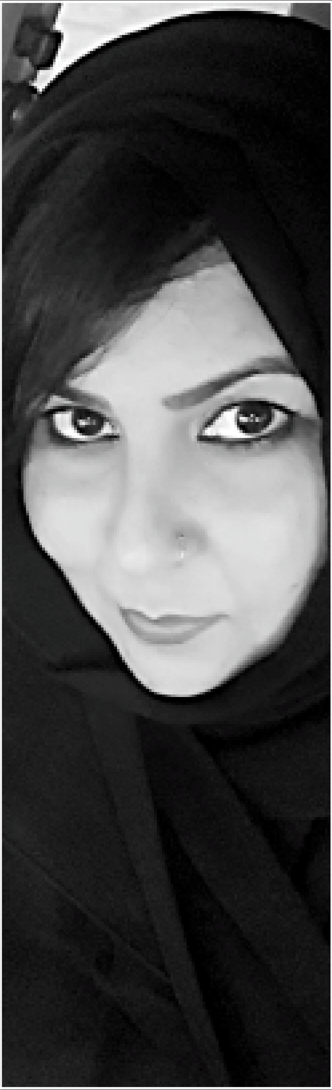

محبت پر لکھنا چاہوں
تو فقط اتنا لکھوں گی
محبت ڈھونگ ہے بس
عمر کا روگ ہے بس
تا حیات سوگ ہے بس
محبت پر لکھنا چاہوں
تو فقط اتنا لکھوں گی............

جو مٹا دے تری ہستی کو
اجاڑے دل کی بستی کو
رلا کے رکھ دے ہنستی کو
سیاہ کر دے دل کی تختی کو

محبت پر لکھنا چاہوں
تو فقط اتنا لکھوں گی
فقط اتنا لکھوں گی............

فرح شاہد

''اجنبی کے نام خط''

صغیر احمد صغیر

تم الیکٹران کی موجوں کا دائرہ ہو
جو ہر دم مجھے محبت کے احساس سے سرشاری عطا
کرتا ہے

تم oxytocin کا وہ مالیکیول ہو
جو ہر وقت میرے Amygdala میں
سنسناہٹ پیدا کرتا رہتا ہے

تم گلوکوز کا نواں isomer ہو
جو خدا نے دل میں مٹھاس کے لئے بنا کر مجھ پہ نازل کیا

تم امائنو ایسڈز کا alpha Carbon ہو
جو دوستوں کے درمیان آ آ آ
وجہِ دوستی ہے

تمہارے ہونٹوں سے ایتھنز کے خداؤں نے
پیاس بجھانے کو nectare کشید کیا۔
جو nectare ان کے Acetabulum سے
چھلک گیا وہ گلاب، چنبیلی نے کارپلز میں جمع کر لیا۔

تمہاری ہتھیلیوں سے اقلیدس نے brackets
ایجاد کیں۔
حروفِ ابجد کا 'الف' تمہارا سراپا تھا۔
تم نہیں جانتی
کہ تم انتہائے حسنِ تخلیق ہو
وہ انتہا جس نے ہر تخلیق کو ابتداء عطا کی۔

محبت ایک عالمی مسئلہ ہے

لکھنے کے لیے
نیند میں کتنے پہر
جاگتے لمحوں کی سرشاری میں
گذارے جائیں
وہ الفاظ
ابھی ایجاد نہیں ہوئے
جو محبت کی سائنسی تفہیم کرسکیں
وفا کو
روبوٹ کے قالب میں ڈھال کر
بے لوث جذبوں کی نمائش کرسکیں
خلوص کو
تجربہ گاہ میں رکھ آئیں
عشق کے اجزاء کا تجزیہ ممکن ہوسکے

ویسے بھی
محبت فارمولا نہیں
ایسا تجربہ
جسے بار بار دہرایا جاسکے
مگر محبت
ایک عالمی جذباتی مسئلہ ہے
ایسا سوال
جس کے جواب پر حکومتیں خاموش ہیں
ایسی گتھی
جسے فلسفی سلجھانے سے قاصر ہیں

اور
محبت کسی قاعدے کی ہرگز محتاج نہیں
یہ دلوں کی سرزمین پر
بارش کی پہلے قطرے کی طرح گرتی ہے
یہ آنکھ کے کنارے پر
اُدھورے وصل کی صورت ٹھہرتی ہے
اجنبی موسم کی طرح
کائنات کے ہر ملک، شہر، دلوں پر
حکومت کرتی ہے

اور تُم
صحرا کے مغربی کنارے
گداز لمحوں کی میزبانی کرتے ہوئے
کتنے اچھے لگتے ہو!
جیسے رات کی تاریکی میں
محبت کا بے نام مسافر
ٹارچ کی مدھم روشنی میں
راستہ کھوجتا ہے
مگر اُسے معلوم نہیں ہوتا
کہ جنگل میں کتنے زخم سانس لیتے ہیں
کتنے دُکھ پتوں پر ٹھہرے ہوئے ہیں
کتنی صدیوں کی تنہائی
ہوا میں تحلیل ہوچکی ہے

امجد بابر

اَن کہی

ان کہی، ان سنی
نظمیں، غزلیں
میرے تخیل کے سمندر میں
مارتی ہیں ٹھاٹھیں
میں کاغذ قلم اٹھائے
ان لہروں کا انتظار کرتا ہوں
اور جب
چند بوندیں الفاظ بن کر
اترتی ہیں کاغذ پر
نظمیں، غزلیں بنتی جاتی ہیں
ایسا بھی ہوتا ہے
کہ مجھے الفاظ نہیں ملتے
جو ان بوندوں کو سنبھال سکیں
تب یہ بوندیں
میرے تخیل کے ساحل پر
پڑی تڑپتی رہتی ہیں
ان سنی ان کہی

طے یہ ہوا تھا

طے یہ ہوا تھا
ہجر کے بعد
وصل ہوگا
تم ہوگے
میں ہونگا
اور
برسات کا موسم ہوگا
طے یہ ہوا تھا
کہ اگر ملن نہ ہوا
تو
یاد ساری عمر
دل میں بسائے رکھیں گے
طے یہ ہوا تھا
رہنا پڑ گیا ہم کو
علیحدہ علیحدہ
تو
زندگی ساری اکیلے گزار دیں گے
طے یہ ہوا تھا
کچھ نہ ہو سکا
تو
تیرا اور صرف تیرا
نام لے کر ہم جی لیں گے
طے تو بہت کچھ ہوا تھا
مگر
شاید تم بھول گئے
تم بدل گئے
اور
میں آج تک
اپنے وعدے پر کھڑا ہوں
تمہارے لئے
تمہارے انتظار میں

محمد کلیم

شام

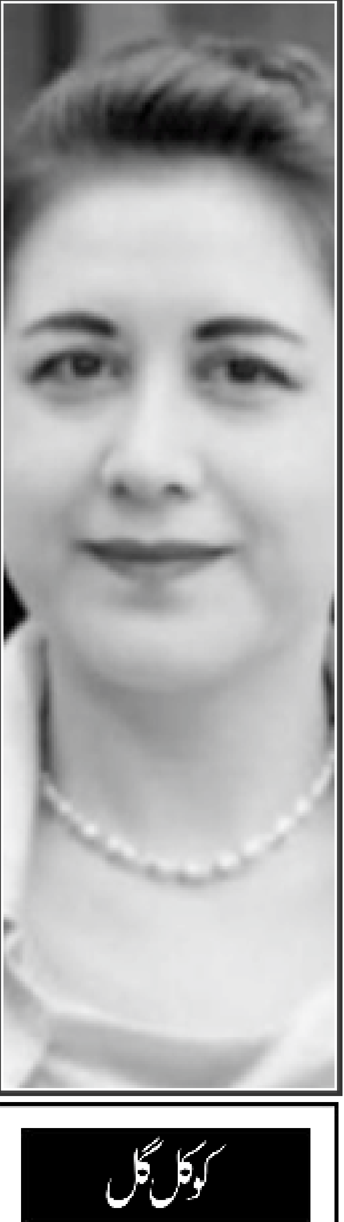

کبھی اک شام ___ جو ہم نے
یہاں مل کر گزاری تھی
میں ایسی شام کی اب تک، کبھی یادیں نہیں بھولی
میں تجھ کو بھی نہیں بھولی
تیری باتیں نہیں بھولی
تو آ کے ساتھ دے میرا
کوئی تدبیر کر کے ہم
کوئی رستہ تو پا جائیں
نئی شمعیں جلا جائیں
ذرا سی روشنی کر کے
سویرا اس میں بھر جائیں
کہ ہر عاشق کو کیوں کوئی
فقط ناکام ہی جانے
کہ ہر قصے میں ہی بس، عاشقوں کو مرنا پڑتا ہے
مجھے قصہ بدلنا ہے
کہ تیرے ساتھ جینا ہے!
وہ تیرے ساتھ بیتی، ساری شامیں
پھر سے جینا ہیں
ترے ہی ساتھ جینا ہے

کوکل گل

نظم: یہ دریا جو مسلسل بہہ رہا ہے

یہ سورج کل نیا ہوگا---
کنارہ،
ہم جس پہ بیٹھے ہوئے آئندگاں کے
سبز باغوں میں ٹہلتے ہیں
فقط پلکیں جھپکتے ہی نئی مٹی پہن لے گا---
شجر،
ہم جس کے سائے میں کڑی تیزاب جیسی
دھوپ سے بچنے کی خاطر بیٹھتے ہیں
پنچھیوں کی چونچیں کھلتے ہی پرانا جسم
تازہ جسم سے تبدیل کر لے گا
سو چھاؤں بھی نئی ہوگی
وہ پنچھی بھی ---
یہ دریا جو مسلسل بہہ رہا ہے
جس کا باطن داستانوں سے بھرا ہے
رایگانی کی چٹانوں سے بھرا ہے
دوسرا پاؤں کوئی کب اس کے دل پر
رکھ سکا ہے---

ہاں،
مگر ہیرا کلائٹس کی قسم!!!
تم تم ہو اور میں میں---
اگر اک دوسرے میں ضم بھی ہم ہو جائیں
(جیسے دو ستارے اینڈرومیڈا میں ہوتے ہیں)

یہ تنہائی نہ اپنی گھٹ سکے گی---
آتشِ تنہائی،
جو ازلی تغیر کا سبب ہے
جو تمہاری اور میری ذات کے تاریک
تہ خانے میں دہکائی گئی ہے
ہمیشہ سے یہیں ہے
اور رہے گی---

مہر علی

قوسِ قزح

یہ آج ہوا ہے کیا مجھ کو
میں کن سوچوں میں غلطاں ہوں
ہیں دن پیچھے کو دوڑ رہے
ماضی کی قوسِ قزح کے رنگ
جو شوخ نہیں پر اچھے ہیں
مرے جذبوں جیسے سچے ہیں
مرے ذہن کے کینوس پر اب کے
بے رنگ سے کتنے رنگوں سے
اک چہرہ بنتا جاتا ہے

ترقی

آج کے دور میں
"با تہذیب ترقی یافتہ" انساں نے
اپنے من کی سچائی کو
لوری دینا سیکھ لیا ہے

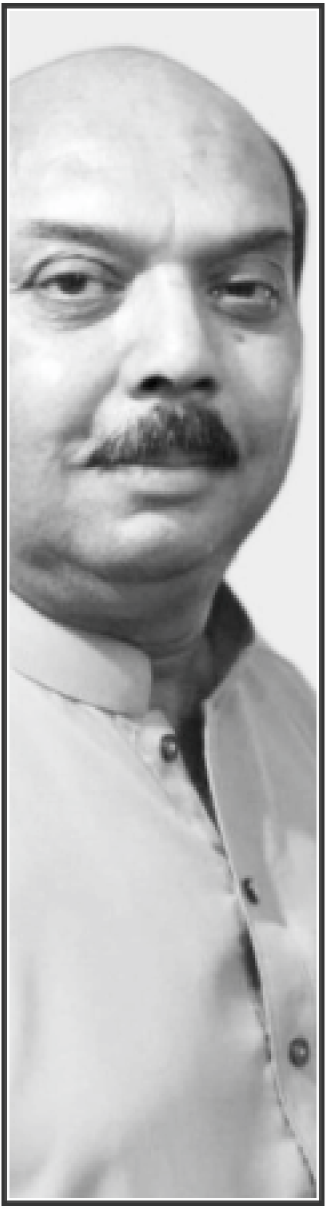

منیب سلطان بیبا

آشنائی کا تذبذب

میں ہیولوں کی تاریخ کو نظم کرنے میں
مصروف تھا

میرے گھر میں
کہیں کوئی جائے اماں تک نہیں
مجھ کو معلوم کب تھا!
مگر ۔ ۔ ۔ !

ویسے سچ بات ہے
اُن دنوں مجھ میں اتنی سکت ہی کہاں تھی
کہ میں اپنے سائے کو اپنی صدا سے
ذرا ہٹ کے دیکھوں

سنو، اُن دنوں
میں اُدھر شہر میں اولیں اجنبی،
آخری آشنا تھا، مگر ۔ ۔ ۔
یار لوگوں کے ہمراہ ۔ ۔ ۔

میرے دائیں طرف چار گھر چھوڑ
کر ۔ ۔ ۔
لیکن ۔ ۔ ۔
اس داستاں میں روایت کی خستہ شکستہ
جھلک تک نہیں
اور مجھے اپنے آغاز، انجام دونوں
غلط کیا،

سرے سے دکھائی نہیں دے رہے

یاد کیجیے
یہیں شہر میں
اس جگہ، ایک دن
بات حد سے بڑھی تو میں چپ چاپ اٹھا
اور اپنی طرف آ گیا

میر صاحب!
گلابی، شرابی لبوں کی کہانی
سے مجھ عہدِ کج آئنہ کو ۔ ۔ ۔
مگر چھوڑیے ۔ ۔ ۔
ایسی جلدی بھی کیا
دو گھڑی بیٹھیے،
گفتگو کیجیے
میرے اشعار سنیے ۔ ۔ ۔
اِدھر دیکھیے،
دھیان دیجے ذرا ۔ ۔ ۔
آپ پھر کھو گئے
جائیے،
مَیں، اکیلا بہت ہوں یہاں!

میراجی!
"ایک آیا ۔ ۔ ۔ گیا ۔ ۔ ۔ دوسرا ۔ ۔ ۔"

نوید صادق

لیکن اُس وقت،
آپ اُس دھندلکے میں کیا کر رہے تھے وہاں!
مَیں نے بغداد سے ہو کے آئی روایات کو
اپنے کھیتوں کی سرسبز مٹی میں دفنا دیا
اور سوچا نہیں۔۔۔
جنگ میں ٹھیک سے پڑھنا لکھنا تو ممکن نہیں
مَیں۔۔۔
مجھ کو افسوس ہے!
مَیں ہیولوں کی تاریخ منظوم کرنے میں
مصروف تھا
میں نے دیکھا نہیں
تم اچانک کہیں سے چلے آئے تھے
تم نے دیکھا
مگر میں نے دیکھا نہیں
تم اُٹھے،
اُٹھ کے چل بھی دیے
میں نے روکا نہیں
میں ہیولوں کی تاریخ کی نظم کاری میں مصروف تھا
وہ ہیولے جو تن من کی ہر آس کو کھا گئے
شہر کے سبز کل، آج کے زندہ احساس کو کھا گئے

ان ہیولوں کی تاریخ
لکھنے پہ میرے علاوہ
یہاں کوئی مامور ہے!؟

بے بسی کا کینسر تو ہو ہی جاتا ہے

نماز پڑھتے شخص پر
شرابی قے کر جائے
عرق گلاب سے فرش دھویا جائے
شراب سے داڑھی نم کی جائے
خنجر کی نوک سے گال تھپتھپائے جائیں
سور کی چربی سے زلفوں کو سنوارا جائے
انصاف کی پرچی پکڑنے کے لیے
میلوں بھاگنا پڑے
تو بے بسی کا کینسر تو ہو ہی جاتا ہے
کوئی سفید لباس پر خون کی پچکاری مارے
پھر فتح مبین کا طغرا دکھائے
راہ چلتا ہاتھ ملے
دھوبی ہمدردی جتلائے
پولیس قاتل سمجھے تفتیشی آمدنی کا ذریعہ بنائے
ہمسائے آنکھ چرائیں
تو بے بسی کا کینسر تو ہو ہی جاتا ہے
کوئی قصویٰ کے پاؤں کاٹے براق کے پر کترے
ذوالفقار سے سور ذبح کروائے
ہاتھ پاؤں باندھ کر مٹی کی ڈھیری بنائے
تو بے بسی کا کینسر تو ہو ہی جاتا ہے
بے بسی کا کینسر بدن کو نڈھال کر دیتا ہے
اس کا زہر محبت ہمدردی ایثار نرم گفتگو
سے محروم کر دیتا ہے آپ ساکت کھڑے
ہوتے ہیں
لوگوں آپ کو کہسار سمجھتے ہیں
مگر اندر سے آپ دم کٹا چوہا ہوتے ہیں
دم کٹے چوہے کی جتنی بھی تعریف کرو
سورۃ فتح کی آیات سناؤ
بہادری کے میڈل دو
چاہے سیسہ پلائی دیوار کہو
مگر بے بسی کا کینسر تو ہو ہی جاتا ہے
بے بسی کا کینسر بے رنگ بے بو ساعت ہے
محروم ہر ادارے میں پھیل چکا ہے
ھل من ناصر ینصرنا کا جواب نہ ملنے پر

اعجاز رضوی

مایوسی ٹکر مارتی ہے تنہائی روندتی ہے
دولت کی کشتی پر بیٹھا ظالم
حوضِ کوثر پر پہلے پہنچ جاتا ہے
پیغمبر سلیماں کے جن برق رفتاری
سے عاری نظر آتے ہیں
جب ملکہ بلقیس لباس بدل بدل کر
صفائی مہم چلا رہی ہو
جب بڑی بڑی عمارتوں میں بیٹھے بونے
ٹوکرے بھر بھر کر گند پھینک رہے ہوں
جب انصاف کا ترازو ہوا تول تول کر
حکمران کو دے رہا ہو
جب غریب کا سانس لینا اصراف شمار کیا جائے
تو بے بسی کا کینسر تو ہو ہی جاتا ہے
جب نجف و کربلا کے درمیاں بیٹھے زائرین
آگ کے جوتے پہنا رہے ہوں
جب مکہ اور مدینہ کی گواہی کی تصدیق پاؤں کے
انگوٹھے لگا کر کی جا رہی ہو
جب کلاشنکوف سے حسب نسب ناپا جا رہا ہو
تو...... بے بسی کا کینسر تو ہو ہی جاتا ہے

میں اور دنیا داری

کہیں تالاب میں مینڈک کی ٹرٹر سے
کنول کا پھول سہما ہے
کہیں گنبد پہ آوارہ کبوتر صبح سے ڈر کر
اندھیری رات کے حق میں دعائیں
مانگتا ہے اور
کہیں الو کی خواہش پہ پرندے شیر کو
محصور کرتے ہیں
تو سورج مسکراتا ہے
میں اس منظر سے ڈرتا ہوں
مگر سورج، کبوتر، پھول، مینڈک شیر اور
ننھے پرندے
سب میری ہستی کا حصہ ہیں
میں اُن سے ڈر تو سکتا ہوں
مگر اُن سے الگ رہنا میری طاقت سے
باہر ہے

اعجاز رضوی

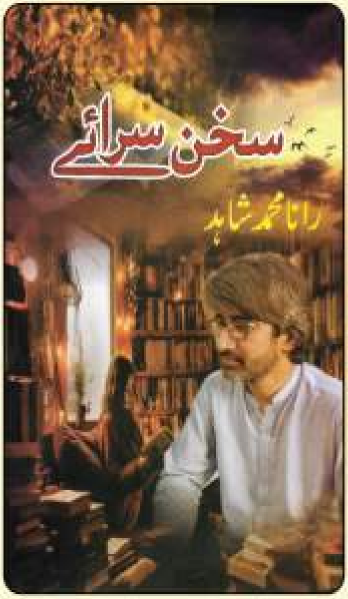
سخن سرائے
رانا محمد شاہد

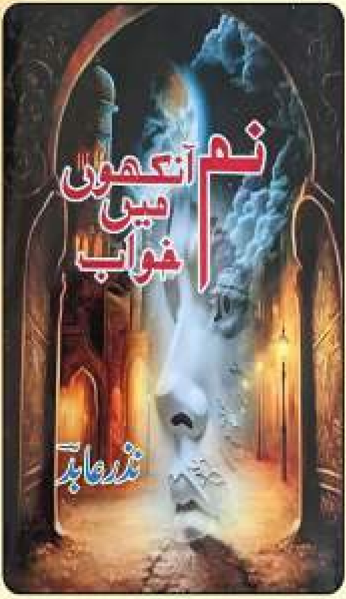
نم آنکھوں میں خواب

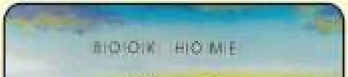
عصیان
فروغ فرخ زاد

سید عامر محمود
ہنگامِ سفر

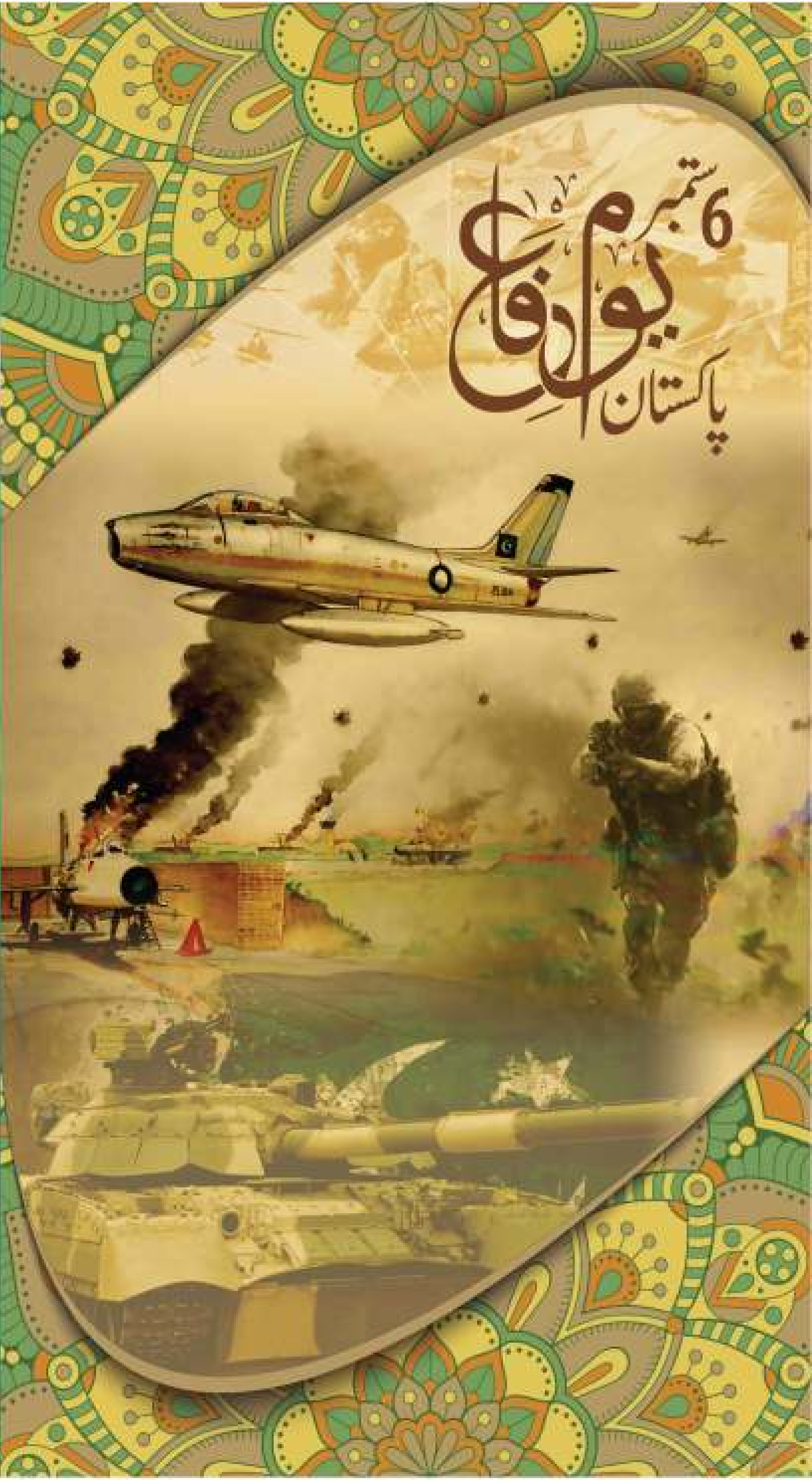
6 ستمبر
یومِ دفاعِ پاکستان